زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

ہندوستان میں ۸ سال کی خریداری صرف ۱۰۰۰ روپے میں دستیاب ہے

نوٹ: (اوپر کی رقوم ہندوستانی روپے میں دی گئی ہیں)

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- ماخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جزاور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۲ ماہ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۰۸ء عدد ۳

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڈھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

اسرائیل کے ذریعہ غزہ کے خلاف مسلط کیا جانے والا مکمل محاصرہ جون ۲۰۰۷ء سے جاری ہے اس مختصر سے قطعہ ارض میں بسنے والے سولہ لاکھ فلسطینی اس محاصرہ کی وجہ سے ناقابل بیان مشکلات مصائب کے شکار ہیں، دوا، خوراک، ایندھن اور دوسری ضروری اشیاء بہت پہلے کمیابی سے آگے بڑھ کر نایابی کی حد میں داخل ہوچکی ہیں، وہاں کے عوام بالخصوص بوڑھے، بچے اور خواتین جن مسائل سے دن رات دوچار ہیں ان کا تصور بھی مشکل ہے، اس اذیت ناک صورت حال کے خلاف عالم عرب اور عالم اسلام سے نہ تو کوئی قابل ذکر آواز بلند ہوئی اور نہ اس محاصرہ کو توڑنے کی کوئی کوشش سامنے آئی، رفح سرحدی چوکی کے ذریعہ مصر اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مشکلات کو بڑی حد تک کم کرسکتا تھا لیکن مصری حکمراں کوئی ایسا کام کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے جس سے امریکہ اور اسرائیل کی ابرو کے شکن آلود ہونے کا اندیشہ ہو چنانچہ وہاں سے نہ تو کسی کو آنے جانے کی اجازت دیتے ہیں اور نہ کسی طرح کی رسد کی آمد و رفت کی، فلسطینیوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا لیکن عالم اسلام اس ٹریجڈی کا خاموش تماشائی بنا رہا، اس کے شب و روز کے معمولات پر اس کا کوئی معمولی اثر بھی محسوس نہیں ہوا اور کاروبار زندگی ویسے ہی چلتا رہا جیسے پہلے چلتا تھا۔

عالم اسلام کے لیے یہ بات باعث شرم ہے کہ فلسطینیوں کی بے کسی اور بے بسی کا احساس ان لوگوں نے کیا جن کی غالب اکثریت غیر مسلم ہے اور امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک سے تعلق رکھتی ہے، ان کی کوششوں سے فری غزہ موومنٹ (Free Gaza Movement) کا قیام عمل میں آیا، اس تحریک نے اس راہ میں حائل غیر معمولی خطرات اور عالمی صہیونی دباؤ کے باوجود اس محاصرہ کو توڑنے کے مقصد سے ۴۶ رضا کاروں پر مشتمل ایک گروپ سمندر کے راستے غزہ کے لیے روانہ کیا، یہ رضا کار مختلف مذاہب، قومیتوں اور ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں ایک ۸۰ سالہ عیسائی نن بھی شامل ہیں جو سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر کی بہن ہیں، اسرائیل نے اس گروپ کو ڈرانے، دھمکانے اور ان کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کے ناقابل شکست عزم کے سامنے منہ کی کھائی، یہ گروپ سائپرس سے دو کشتیوں میں اس آبی گذرگاہ سے عازم غزہ ہوا جس پر مدت سے کوئی کشتی نہیں گذری تھی۔ نہتا لیکن عزم، انسانی ہمدردی اور امن و آزادی کے جذبات سے معمور یہ گروپ وہ کارنامہ انجام دینے میں کامیاب ہوا جس کا حوصلہ وسائل سے مالا مال عرب حکومتیں نہ کر سکیں، انہوں نے بالآخر ۲۳ راگست کو اسرائیل کے اس جابرانہ محاصرہ کو توڑ دیا، یہ ایک تاریخ ساز واقعہ تھا، یہ اس بات کا زندہ ثبوت تھا کہ عوامی طاقت کے آگے بڑی سے بڑی حکومتیں بھی گھٹنا ٹیکنے پر مجبور ہوجاتی ہیں،

اس نئی ابتداء، نئی امید، نئی زندگی اور نئے امکانات کا پیغام لانے والوں کا استقبال فلسطینیوں نے کس طرح کیا ہوگا اور ان کے لیے دیدہ و دل کو کس طرح فرش راہ کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔

چند دن غزہ میں گذارنے کے بعد اور ۲۲ رستمبر کو پھر واپس آنے کے عزم کے ساتھ یہ گروپ ۲۸ راگست کو واپس سائپرس لوٹ گیا جہاں سے اس نے اس تاریخی سفر کا آغاز کیا تھا، واپس جاتے ہوئے گروپ نے اپنے ۹ رضا کاروں کو وہاں کے حالات پر نظر رکھنے کے لیے غزہ میں چھوڑ دیا اور ان کی جگہ پر کچھ فلسطینیوں کو ساتھ لے گئے، اس بہادرانہ کوشش کے چند دن کے اندر ہی اس کے دور رس اثرات مرتب ہونا شروع ہوگئے، سب سے پہلے تو اسرائیل کی وزارت خارجہ نے محاصرہ کے سلسلہ میں اپنے سخت گیر موقف میں ایک نہایت اہم تبدیلی کا اعلان کیا، وزارت خارجہ کے ایک اعلامیہ میں کہا گیا کہ آئندہ انسانی حقوق اور انسانی امداد سے تعلق رکھنے والے کسی مشن کو روکنے اور ان کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش نہیں کی جائے گی، اس پر کہاں تک عمل ہوگا یہ تو مستقبل ہی بتائے گا البتہ یہ اعلان بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں، ادھر مصری حکام نے بھی رفح چوکی سے چند مریضوں کو مصر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی، پھر یہ خبر آئی کہ مصری ججوں، مختلف پارٹیوں کے نمائندوں اور عوامی حلقوں کا ایک نمائندہ گروپ رفح کے راستے غزہ میں داخل ہونے اور اس طرف سے اس محاصرہ کو توڑنے کی کوشش کرے گا، قرائن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فری غزہ موومنٹ کی یہ پہل نتائج کے لحاظ سے ایسی ہی اہمیت کی حامل ہوگی جیسے دیوار برلن سے نکالی جانے والی پہلی اینٹ، جس طرح دیوار برلن عوام کی طاقت کے سامنے تودہ ریگ کی طرح بکھر گئی اسی طرح نہ صرف یہ محاصرہ ختم ہوکے رہے گا بلکہ اس سے ایک ایسی تحریک جنم لے گی جس کو نہ اسرائیل روک سکے گا اور نہ امریکہ، فری غزہ موومنٹ کا یہ کارنامہ تاریخ میں آب زر سے لکھا جائے گا، یہ فلسطینیوں کی آزادی اور ایک باعزت زندگی کے حصول کی طویل اور جاں گسل جد و جہد میں ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا، حماس کی قیادت میں فلسطینیوں نے جس ایمانی بصیرت، جرأت، استقلال اور پامردی سے اس کمر توڑنے والے محاصرہ کا مقابلہ کیا ہے اس سے ثابت ہوگیا ہے کہ وہ ایک زندہ قوم ہے، ایک زندہ قوم کو کچھ دنوں کے لیے دبایا تو جاسکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ترکی کی سپریم کورٹ آف اپیل کے چیف پبلک پراز یکیوٹر نے آئینی عدالت میں حکمراں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (A.K.P.) کے خلاف ۱۴ رمارچ ۲۰۰۸ء کو ایک اپیل دائر کی جس میں پارٹی کو ممنوع قرار دیئے کی درخواست کی گئی تھی، بنیادی دلیل یہ تھی کہ پارٹی کی اسلامی ترجیحات ملک کے سیکولر دستور کے منافی ہیں، فرد جرم بہت طویل تھی اور ۲۴۵۵ صفحات پر مشتمل تھی، الزامات میں الکوحل کی خرید و فروخت پر

شذرات

پابندی کی کوشش اور خواتین کے سرڈھکنے کی آزادی سے متعلق پارلیمنٹ کے ذریعہ منظور شدہ قانونی ترمیم سرفہرست تھے، ترکی جامعات میں خواتین کو سرڈھکنے کی اجازت نہیں ہے، جس کی وجہ سے دینی رجحان رکھنے والی بہت سی طالبات اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں، اس قانونی ترمیم کے ذریعہ صرف اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ اگر کوئی طالبہ اپنا سرڈھکنا چاہے تو اسے اس سے نہ روکا جائے، بعد میں عدالت نے اس قانون کو کالعدم قرار دے دیا اور اب پھر جامعات میں سرڈھکنے کی اجازت نہیں ہے، ملک کی سیکولر طاقتوں نے ان اقدامات کو ملک کے مستقبل کے لیے ایک بڑا خطرہ تصور کیا اور جو مقصد وہ الیکشن کے ذریعہ حاصل نہیں کرسکے تھے اسے عدالت کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی، آئینی عدالت اس سے پہلے ۲۴ پارٹیوں کو کالعدم قرار دے چکی ہے، اس لیے اس بات کا قوی اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ترکی میں اسلامی اقدار کے احیاء کے خلاف سیکولر طاقتوں کی یہ سازش کامیاب ہوجائے گی، تقریباً پانچ مہینے کی غیر یقینی صورت حال کے بعد عدالت نے ۳۰ رجولائی کو اپنا فیصلہ سنادیا اور نہ صرف ترکی نے بلکہ پورے عالم اسلام نے اطمینان کی سانس لی، پارٹی کو غیر قانونی قرار دینے کے لیے مقدمہ کی سماعت کرنے والی ۱۱ رکنی بنچ کے ۷ ارکان کے اتفاق رائے کی ضرورت تھی، ۶ ارکان پارٹی پر پابندی عائد کرنے کے حق میں تھے جب کہ ۷ ارکان کو اس سے اتفاق نہیں تھا، ان میں چیف جسٹس ہاشم قلیچ بھی شامل تھے، ان ججوں کی رائے میں بھی یہ بات صحیح تھی کہ پارٹی سیکولر مخالف سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت اختیار کرچکی ہے لیکن ابھی یہ اس حد کو نہیں پہونچی ہیں جہاں پارٹی کو ممنوع قرار دینے کا جواز پیدا ہو، پارٹی پابندی سے تو بچ گئی البتہ اس مخصوص صورت حال کے پیش نظر عدالت نے اس سلسلہ میں دو ایسے اقدامات کیے جنھیں پارٹی کے لیے سزا ہی تصور کیا جاسکتا ہے، ایک تو یہ کہ عدالت نے پارٹی کو اپنے معاملات ٹھیک کرنے کے لیے سخت وارننگ (Serous warning) جاری کی، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عدالت ابھی اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کا ارادہ رکھتی ہے، دوسرے قانون کے مطابق پارٹی کو ملنے والی سرکاری امداد کو نصف کردیا گیا، ۲۰۰۸ء کے لیے یہ امداد ۳۹ ملین امریکی ڈالر تھی، اس تفصیل سے جسٹس پارٹی کو ترکی اسلامی اقدار کی بحالی کی راہ جن خطرات اور مشکلات کا سامنا ہے اس کا کسی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے، وزیر اعظم رجب طیب اردگان اور ان کے رفقاء جس ہوشمندی اور بیدار مغزی سے جمہوریت کی راہ سے ترکی معاشرہ میں اسلامی روایات کی بحالی کا کام کررہے ہیں اس سے توقع ہے کہ راستے کی دشواریوں کے باوجود وہ ترک عوام کی غالب اکثریت کی خواہش کے مطابق اس مشن کی تکمیل میں کامیاب ہوں گے۔

مقالات

بَسمَلہ - آیاتِ قرآنی میں

شمار و نظم اور تلاوت و قرأت

پروفیسر ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی*

اس حقیقت میں کسی کو شک ہے اور نہ کوئی اختلاف کہ بَسمَلہ - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، قرآن مجید کی ایک آیت کریمہ ہے اور اس کی تلاوت و قرأت نماز کے اندر اور باہر ضروری ہے، وہ اصلاً آغاز کار کا سرنامہ ہے: سرنامۂ سعادتِ انسانی اور عنوان فیضانِ ربانی، ہر کام سے پہلے اس کی تلاوت و قرأت کرنی ضروری ہے اور باعث ثواب دارین اور ضامن فلاح و کامرانی ہے، ہر تحریر سے پہلے اس کا لکھنا بھی ضروری ہے کہ یہی سنت انبیا کرام اور سنت سید المرسلین بھی ہے (طبری، (محمد بن جریر، م ۳۱۰/ ۹۲۳) جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر طبری)، مرتبہ محمود شاکر/ برادر احمد دار المعارف قاہرہ، ۱۹۵۲ء/ ۱/ ۱۱۴-۱۱۵، نیز مقالہ خاکسار: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حمد اولین، نقوش قرآن نمبر ۲/ ۵ ۴ و مابعد ہے)۔

ایک لحاظ سے بلکہ قرآن کریم کی واضح تصریح و بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر کلام الٰہی کا سرنامہ ہے، تمام انبیا کرام اور رسولانِ اسلام اسی پاک، فیض رساں، طمانیت بخش اور سعادت آگیں کلمہ سے آغاز کرتے تھے، حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو جو گرامی نامہ تحریر فرمایا تھا اس کا سرنامہ یہی کلمۂ عالیہ تھا: ''انه من سلیمان وانه بسم الله الرحمن الرحیم'' سورۃ النمل: ۳۰ (وہ خط ہے سلیمان کی طرف سے اور وہ ہے شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا، شاہ عبدالقادر دہلویؒ وغیرہ مفسرین نے ملکہ کا نام بلقیس ہی لکھا ہے)، خاتم النبیین اور سید المرسلینؐ نے جب ملوک و

---

* ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڈھ۔

سلاطین کے نام اپنے گرامی دعوت نامے ارسال فرمائے تواسی سنت الانبیا بلکہ سنت الٰہی کی پیروی فرمائی تھی بلکہ عجیب حکمت محمدی تھی کہ سرنامۂ الٰہی کو بھی آغاز تحریر میں لکھوایا'' بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد عبد اللہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الروم ، سلام علی من اتبع الھدی ، اما بعد الخ '' (بخاری کتاب بدء الوحی ، ٦ باب (بلاعنوان) ، حدیث ۷ ، جس کے بہت سے اطراف ہیں : ۵۱ ، ۲۶۸۱ ، ۲۸۰۴ ، ۲۹۴۱ ، ۲۹۷۸ ، ۳۱۷۴ ، ۴۵۵۳ ، ۵۹۸۰ ، ۶۲۶۰ ، ۷۱۹۶ ، ۷۵۴۱ ، جومختلف ابواب وکتب بخاری میں ہیں ، مسلم کتاب الجہاد ، باب کتاب النبیؐ الی ہرقل ، نیز دیگر متعدد کتب حدیث وسیرت ، قدیم وجدید) رسول اکرمؐ نے دوسرے تمام سلاطین ایران ومصر وغیرہ کے نام بھی اپنے گرامی ناموں میں اسی بسملہ سے آغاز کیا تھا ، فتح الباری ۱/ ۴۳ - ۶۳ : کتاب بدء الوحی کی یہ آخری حدیث بخاری ہے اوراس کی شرح ابن حجر بھی آخری شرح کتاب ہے ۔

اس میں سب سے دل چسپ بحث رسول اکرمؐ کے نامِ نامی اور اسم گرامی سے آغاز فرمان رسالت مآب کا نکتہ ہے کہ سلاطین وقت کی روایت کبر وغرور کرتے ہوئے رسول اکرمؐ نے اپنے نام نامی سے گرامی نامہ کوشروع کیا تھا اور مکتوب الیہ کا نام وخطاب بعد میں آیا تھا ، اسی بنا پر بعض مشیرانِ بے تدبیر نے ہرقل کوگرامی نامہ پڑھنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی مگر عظیم روم نے اسے پڑھوایا / پڑھا ، حضرت حافظ موصوف نے اصل سرنامہ مکتوب نبوی ، بسملہ - سے کوئی تعرض نہیں فرمایا ، شاید اس لیے کہ وہ معروف حقیقت تھی یا اس کی تشریح کی ضرورت ہی نہ تھی ، بیشتر شارحین حدیث اور سیرت نگاران نبوی نے بھی اس کلمہ عالیہ کے آغاز کی اہمیت وضرورت سے بحث نہیں کی ہے (شبلیؒ ، سیرۃ النبی ، اعظم گڈھ ۱۹۸۳ء ، ۱/ ۶۲ ۴ - ۳ ۷ ۴ ، محمد ادریس کاندھلویؒ ، سیرۃ المصطفیؐ ، دار الکتاب دیوبند غیر مورخہ ۲/ ۷۹ ۳ - ۳۹۰ ومابعد) مولانا کاندھلوی نے بہرحال اتنا لکھا ہے کہ'' خط کی ابتدا اللہ عز وجل کے نام سے ہونی چاہیے ، جیسا سلیمانؑ نے ملکہ سبا کے نام جب والا نامہ تحریر فرمایا توبسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے اس کی ابتدا فرمائی'' مگر مولانا موصوف کا بیان جزوی طور پر صحیح کہا جاسکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے مکتوب عالی کا آغاز اپنے نام سے کیا تھا ، جیسا کہ قرآن مجید کا صاف بیان ہے ، بہ قول مولانا موصوف یہ '' صرف فوائد ولطائف '' کا معاملہ

نہیں بلکہ رسول اکرمؐ کی حکمت بالغہ کا عجیب توفیقی ثبوت ہے کہ آپؐ نے اپنے گرامی ناموں کا آغاز ہمیشہ بسملہ ہی سے فرمایا ، امام طبریؒ نے بہرحال لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کے ذریعہ آپؐ کو بسملہ سے تمام کام کرنے کا حکم دیا تھا (۱/ ۱۱۴) نیز دیگر کتب سیرت جدید ، تفسیر ابن کثیر ۱۶۱/۳ (مصطفیٰ البابی طباعت قاہرہ غیر مورخہ) میں یہ عجیب بحث بھی ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے پہلے کسی اور نبی نے بسملہ نہیں لکھا ، اس پر بحثِ حافظ امام نہیں ہے حالاں کہ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہوسکتا جس طرح انہوں نے اس آیت کریمہ کے باب میں وارد بعض احادیث کی غرابت وضعف پر بحث کی ہے ، اسی طرح حضرت میمون بن مہرانؒ کی یہ روایت کہ اس آیت کے نزول سے قبل رسول اکرمؐ باسمک اللھم لکھا کرتے تھے قابل قبول نہیں ، کیوں کہ روایت ودرایت دونوں کے لحاظ سے وہ صحیح نہیں ، یہ سورۂ نمل مکی ہے اوراس مکی دور متوسط کی ہے جب کہ اس سے پہلے متعدد سورتیں نازل ہوچکی تھیں ، سورۂ فاتحہ اولین کامل سورت ہے جوسب سے پہلے بالکل ابتدا میں نازل ہوئی اوراس میں بسملہ سے ہی آغاز ہے ۔

قرأت وتلاوت کا آغاز : یہ بھی متفقہ امر ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے آغاز سے پہلے بحکم قرآنی تعوذ - اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم - پڑھا جائے اوراس کے بعد بسملہ - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - پڑھا جائے ، یہ محکم امر ہے '' فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، سورۃ النحل : ۹۸ ، سوجب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی ، شیطان مردود سے '' شاہ عبد القادر دہلوی موصوف نے موضح القرآن میں اس پر فائدہ نہیں لگایا ، شاید اس لیے کہ ان کے والد گرامی بڑے شاہ صاحبؒ نے اس پر کچھ نہیں لکھا ہے ، بہرحال دوسری قدیم وجدید تفاسیر میں بحث ہے ، ابن کثیر دمشقی ، تفسیر القرآن العظیم ، نے اول تفسیر میں استعاذہ اور بسملہ دونوں پر کافی بحث کی ہے اور تمام احادیث نقل کی ہیں اوراس سورہ کی تفسیر میں مختصر بات کہی ہے کہ یہ حکم الٰہی واجب نہیں ہے جیسا کہ امام ابن جریر طبری وغیرہ ائمہ کرام نے بیان کیا ہے ، صرف امر مندوب ہے ، اس پر یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مکی سورہ کا ایک '' حکم '' ہے خواہ واجب ہو خواہ مندوب ، مکمل بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ، ۱/ ۱۲ - ۱۶ ، تفسیر الاستعاذۃ و أحکامھا ۔

اسی طرح تعوذ واستعاذہ کے ساتھ بسملہ سے قرأت وتلاوت قرآن کریم کرنے پر

اجماع صحابہ وعلما ہے کہ اسی سے نماز کے اندر قرأت سے قبل آغاز کرنا چاہیے اور نماز کے باہر تلاوت کلام پاک کرنے سے قبل پڑھنا چاہیے، علما کے فقہی اور حکمی اختلاف کے سبب وہ قرأت و تلاوت واجب یا مندوب بن جاتی ہے کہ اس میں اختلاف ہے اور اس کا ذکر آگے تفصیل سے آتا ہے، البتہ اس کے پڑھنے اور اسی سے شروع کرنے پر کسی کا اختلاف نہیں ہے، وہ سنت و حدیث سے بھی ثابت ہے اور دوسرے تعامل اکابر سے بھی، مفسرین کرام نے اس پر کافی تفصیل سے لکھا ہے (ابن کثیر، تفسیر ۱/ ۱۷-۲۱: فصل فی فضلها میں متعدد احادیث وروایات ہیں جن میں بعض بعض تو بہت غریب ہیں)۔

بہ طور آیت قرآنی مقام ومحل: مفسرین کرام نے سورۂ فاتحہ سے قبل بسملہ کی تفسیر وتشریح میں بلاوجہ ابہام اور الجھن پیدا کردی ہے، یہ محض علمائے مابعد کے اختلافی اقوال ونظریات کی بنا پر ہوا، اسے کسی حد تک فقہی اختلاف کا شاخسانہ کہا جاسکتا ہے، مثلاً حافظ ابن کثیرؒ نے آغاز کلام میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کتاب اللہ کا آغاز کیا: ''بسم الله الرحمن الرحيم افتتح بها الصحابة كتاب الله''، اس کے بعد کی بحث بڑی حیرت انگیز ہے، علما کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت - بسملہ - سورہ نمل کی ایک آیت کا حصہ ہے پھر ان کا اختلاف ہے کہ وہ ہر سورت کے شروع میں ایک مستقل آیت ہے یا ہر سورت کی اولین آیت ہے جو اس کے شروع میں لکھی گئی ہے یا وہ ہر سورت کی کسی آیت کا جزو ہے جیسا کہ سورہ فاتحہ میں اس کی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں میں نہیں یا وہ صرف فصل کرنے (ایک سورہ کو دوسری سورہ سے الگ کرنے) کے لیے پہلے لکھی گئی ہے، بہر حال اس پر اتفاق ہے کہ تمام سلف وخلف نے اس کو ایک آیت قرآنی تسلیم کیا ہے، یہی الجھن اور ابہام دوسرے تمام مفسرین کرام کے ہاں نظر آتا ہے۔ (ابن کثیر، تفسیر ۱/ ۱۶؛ مقالہ خاکسار ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - حمد اولیں''، نقوش قرآن نمبر، لاہور ۱۹۹۸ء، ۲/ ۲۵- ۱۴۶ کے اولین صفحات ومباحث اوران کے حواشی جہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بارے میں بہ تمام اصولی بحث کی گئی ہے)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے سورۂ اقراء کی تفسیر میں بہر حال اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ صحابہ کرام نے بسملہ کو دو سورتوں کے درمیان میں لکھنے پر اتفاق واجماع کیا تھا، سوائے سورۂ براۃ کے: ''.....لاتفاق الصحابة على كتابة البسملة بين كل سورتين الا براة......'' اس کے بعد دوسرے ائمہ اور قراء کا خیال ثانی پیش کیا ہے جو مختلف ہے مگر اتفاق واجماع صحابہ کرام کے بعد اس کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔ (فتح الباری، ۸/ ۹۱۲)

قرآن مجید کی تمام سورتوں سے قبل آیت کریمہ: ایک زمینی حقیقت اور اسلامی واقعیت یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے صرف ایک سورۂ توبہ کے سوا تمام سورتوں سے قبل یہ آیت کریمہ اول روز سے لکھی چلی آرہی ہے، اس کی تھوڑی تفصیل ضروری ہے، تدوین قرآن کریم کا یہ عظیم الشان معجزہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے تمام سورتوں کی ترتیب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی، اس لیے وہ ''توقیفی'' کہلاتی ہے اور اس ترتیب سُور کو نہیں بدلا جاسکتا جس طرح ایک سورہ کی آیات کریمہ کی ترتیب نہیں بدلی جاسکتی، دونوں توقیفی ہیں، لہذا آپؐ نے جب قرآن مجید کو اپنی حیات بابرکات کے اواخر میں مدون کرایا تو بسملہ اسی طرح ہر سورۂ کریمہ کے آغاز میں لکھی گئی تھی اور صرف سورۂ توبہ کے شروع میں نہیں لکھی جاسکی تھی، صحف صدیقی کی شکل میں جب قرآن مجید کے مصحف کی تدوین کامل ہوئی تو وہ اسی تدوین نبوی اور طریقہ تدوین پر مبنی تھی، حضرت عثمان بن عفان ذوالنورینؓ خلیفہ سوم اور جامع قرآن کریم نے اسی مصحف صدیقی / مصحف نبوی پر تدوین نو کی، اس آخری عثمانی تدوین نو کی دوسری جہات کی اہمیت سے قطع نظر وہ خالص نبوی تدوین وترتیب قرآنی تھی، اسی کارنامہ عثمانیؓ نے مصحف قرآن مجید کو یکسانیت واتفاق عطا کردیا کہ تمام دوسرے مصاحف و اوراق کو نیست ونابود کردیا گیا، اب علما وفقہا ہی کا نہیں پوری امت اسلامی کا اجماع واتفاق ہے کہ ''رسم مصحف عثمانی'' کی پیروی کرنی واجب ہے، اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب اور ایک سورہ کی باہمی اندرونی آیات کی ترتیب نہیں بدلی جاسکتی بلکہ اس کا املا، رسم خط اور اس سے متعلق دوسری تمام چیزوں میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

اس امت خیر کی بے مثال واقعیت، تاریخ کی بے نظیر حقیقت اور علمائے فن کی یکسو اجتماعیت کی بنا پر قرآن مجید کی ایک سو تیرہ سورتوں سے قبل بسملہ الگ سے، ممتاز طور سے، بالکل علاحدہ لکھی جاتی ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جو اختلاف علما کی اور ان کے نظریات فقہی اور افکار تدوینی کی حقیقت واشگاف کرتی ہے، سورۂ توبہ سے قبل بسملہ کے نہ لکھے جانے کی مختلف

توجیہات وتاویلات کی گئی ہیں جو سب کی سب استنباط پر مبنی ہیں، صحیح ترین اور اصلی وجہ وہی ہے جو جامع قرآن نے فرمائی تھی کہ رسول اکرمؐ نے سورہ توبہ سے قبل اسے نہیں لکھوایا تھا، لہذا میں نے بھی اسی سنت نبوی کی پیروی میں نہیں لکھوایا، یہ محض سنت وعمل نبوی کی پیروی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اس حقیقت کا اثبات تھا کہ قرآن مجید میں "غیر قرآن" کا ایک لفظ، ایک کلمہ بلکہ ایک حرف ولفظ نہ لکھا جائے، متن قرآن کریم میں صرف اور صرف قرآن کریم ہی ہو، اسی معجزہ قرآنی کی کارگذاری ہے کہ "غیر قرآن" کسی طرح بھی قرآن کریم میں داخل نہیں ہوسکا، حتی کہ وہ آیت قرآنی جو سب سورتوں کے آغاز میں موجود ہے سورہ توبہ کے آغاز میں بار نہ پاسکی محض اس لیے کہ حامل وحیِ الٰہی اور مہبطِ وحیِ قرآنی حضرت محمد رسول اللہؐ نے اسے اس مقام پر نہیں لکھوایا تھا۔

اختلافِ علما کا تجزیہ: تمام قدیم وجدید مفسرین کرام نے بسملہ کے بارے میں مختلف نظریات وخیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا ایک تجزیاتی اختصار درج ذیل ہے:

آیت فصل: یہ آیت کریمہ --بسملہ- آیت فصل ہے جو ایک سورہ کو دوسری سورہ سے الگ کرکے ممتاز کرتی ہے، حافظ ابن کثیر دمشقیؒ نے ابوداؤد کی ایک حدیث حضرت ابن عباسؓ صحیح اسناد کے ساتھ نقل کی ہے کہ رسول اکرمؐ سورہ کا فصل نہیں جانتے تھے تا آنکہ آپؐ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی، مستدرک امام حاکم وغیرہ سے بھی اس تائیدی روایت کا حوالہ دیا ہے، دوسرے مفسرین کرام نے بھی اسی قسم کی روایات نقل کی ہیں۔ (ابن کثیر، ۱/۱۶: وفی سنن ابی داود باسناد صحیح عن ابن عباسؓ أن رسول اللهؐ كان لا يعرف فصل السورة حتى ينزل عليه "بسم الله الرحمن الرحيم" واخرجه الحاكم ابو عبد الله النيسابوری فی مستدركه ايضا وروى مرسلا عن سعيد بن جبير ......"

حافظ موصوف نے کچھ دیر بعد امام داؤد کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ہر سورہ کے شروع میں ایک مستقل آیت ہے مگر کسی سورہ کا جزو نہیں: "...... هی آية مستقلة فی اول كل سورة لا منها" یہی امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت ہے۔

اس پوری بحث میں دو اہم نکات ہیں: ایک یہ کہ بسملہ آیت فصل ہے اور ہر ایک سورہ سے پہلے نازل کی گئی، تاکہ دوسری سورت کا آغاز ممتاز و علاحدہ ہوجائے، دوسرے یہ کہ رسول اکرمؐ اس

کے نزول سے قبل ایک سورت کو دوسری سورت سے جدا کرنے کی حقیقت سے آگاہ نہ تھے، اول نکتہ تو قابل قبول ہی نہیں صحیح ترین اور واقعی بھی ہے، البتہ دوسری بات کے سلسلے میں مسئلہ بلکہ مسائل پیدا ہوتے ہیں: ایک یہ کہ روایتی طور سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت مراسیل صحابہ میں آتی ہے جو اگرچہ قابل حجت ہیں لیکن وہ بہر حال ان تک دوسرے صحابہ سے ملی تھی کہ وہ اس کے نزول کے وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے، دوم درایتی طور سے اس میں خاصا جھول ہے کہ رسول اکرمؐ فصل سورہ سے آگاہ نہ تھے، بسملہ کا نزول کب ہوا اور کس سورہ کے ساتھ ہوا اور بعض دوسرے مسائل جن کا ذکر وحل آگے آتا ہے۔

آیت بسملہ کا نزول: حدیث بخاری-۳ کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ پر اولین وحی قرآنی سورۂ اقراء کی ابتدائی آیات کریمہ: ۱-۳ پر مشتمل تھی جس کا آغاز ہوتا ہے نامِ رب سے پڑھنے کے ساتھ، اقرأ باسم ربک الذی خلق، اس حدیث بخاری کے متعدد اطراف ہیں: ۳۳۹۲، ۴۹۵۳، ۴۹۰۰، ۴۹۵۶، ۴۹۵۷ اور ۶۹۸۲؛ کتاب بدء الوحی، باب ۳ بلا عنوان؛ فتح الباری، ۱/۲۹-۳۲ ومابعد اور دوسرے ابواب وکتب کے صفحات، مسلم، باب بدء الوحی، نیز دیگر کتب حدیث وسیرت۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی شرح حدیث میں متعدد چیزوں سے بحث کی ہے مگر بسملہ کے مسئلہ سے بحث نہیں کی، بہر حال آیت کریمہ سے خود بہ خوبی واضح ہوتا ہے کہ اس اولین وحی اور اولین آیت منزلہ سے قبل بسملہ نہیں تھی تو اس کا قائم مقام کلمہ "باسم ربک" موجود تھا، غالبًا اس آغاز سے کلام الٰہی کی تنزیل کے قبل بسملہ کی ضرورت بھی نہ تھی، حافظ موصوف نے بہر حال سورہ اقرأ کی تشریح میں اولین سورت کی تنزیل کے باب میں مفسرین کا اختلاف نقل کیا ہے جو دل چسپ ہے، صاحب الکشاف کے مطابق حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد کا موقف یہ ہے کہ اول اول نازل ہونے والی سورہ سورہ اقرأ ہے جب کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اول نازل ہونے والی سورت فاتحۃ الکتاب ہے مگر اکثر ائمہ نے اول قول کو قبول کیا ہے اور اس کی تائید حدیث حضرت عائشہ بھی کرتی ہے، حافظ موصوف نے صاحب کشاف کے قول پر نقد بھی کیا ہے، اس بحث کا ہمارے موضوع سے دوسرا متعلقہ حصہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے شروع میں بسملہ کا لکھا

جانا ثابت ہوتا ہے اور امام سہیلی شارح ابن ہشام سے اس کی سند پکڑی ہے اور ان کی مختصر بحث، استنباط کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔(فتح الباری، ۸/ ۹۱۲، تفسیر سورۂ اقرأ)

بہ قول صاحب کشاف اکثر مفسرین کے نزدیک اولین سورہ فاتحہ کی تنزیل کا خیال قبول کرلیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اولین آیت کریمہ جو نازل ہوئی وہ بسملہ ہی تھی کیوں کہ اس پر سب کا تقریباً اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ کے آغاز میں یا اس سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی موجود تھی یا اتری تھی، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بسملہ کا نزول اولین ہے۔

لیکن دوسرے خیال ونظریہ کو تسلیم کیا جائے جواب قریب قریب حقیقت ثابتہ بن چکا ہے کہ سورہ اقرأ کی اولین آیات کریمہ ابتدائی یا اولین تنزیل قرآنی تھیں تو بسملہ کی تنزیل موخر ٹھہرے گی اور اس کی توقیت کرنی ہوگی، سردست دوسرے شواہد وآثار سے قطع نظر کرکے صرف سورہ فاتحہ کے نزول کے وقت پر توجہ مرکوز رکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ دوسری بعض سورتوں کی چند آیات کریمہ جیسے سورہ اقرأ، سورہ مدثر، سورۂ مزمل وغیرہ کے معا بعد نازل ہونے والی اولین سورہ ہے، اسی سبب سے متعدد مفسرین وشارحین نے دونوں نظریات وروایات میں یوں تطبیق دی ہے کہ سب سے پہلے کامل سورہ جو نازل ہوئی وہ سورہ فاتحہ تھی اور اس سے پہلے بعض سورتوں کی متفرق آیات کریمہ نازل ہوئی تھیں، بہ قول مولانا مودودی ”یہ نبوت محمدی کے بالکل ابتدائی زمانہ کی سورت ہے بلکہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی مکمل سورت جو محمدؐ پر نازل ہوئی، وہ یہی ہے، اس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں......“۔(مودودی، تفہیم القرآن، ۱/ الف/ ۴۲)

ان شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بسملہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی جب پوری سورتیں موجود ہی نہ تھیں یا نازل ہی نہیں ہوئی تھیں۔

(ب) بسملہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت: حافظ ابن کثیر نے دوسرا نقطہ نظر یا مسلک یہ بیان کیا ہے کہ بسملہ سورۂ فاتحہ کی اولین آیت ہے، صحیح ابن خزیمہ کے مطابق حضرت ام سلمہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اکرمؐ نے نماز میں فاتحہ کے شروع میں بسملہ پڑھی اور اس کو ایک آیت شمار کیا: ”......أن رسول اللہ ﷺ قرأ البسملة فی اول الفاتحة فی الصلوة وعدها آیة“ امام موصوف

نے اس حدیث اور اس کی مخالف روایت پر بحث بھی کی ہے اور نقد بھی اور دوسرا خیال ونظریہ بھی پیش کیا ہے، دوسرے صحابہ اور ائمہ سے اس کی تائید بھی فراہم کی ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت کریمہ ہے۔

(ج) بسملہ ہر سورہ کی اولین آیت: تیسرا نقطہ نظر یا مسلک یہ ہے کہ بسملہ سورہ براۃ کے سوا ہر ایک سورہ کی اولین آیت کریمہ ہے، امام ابن کثیر کے مطابق یہ قول ومسلک حضرات ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اور علی وابوہریرہ رضی اللہ عنہم، صحابہ میں اور تابعین میں عطاء، طاوس، سعید بن جبیر، مکحول، زہری سے مروی ہے اور ائمہ کرام میں سے حضرات عبداللہ بن مبارک، شافعی، احمد بن حنبل (ایک روایت میں)، اسحاق بن راہویہ، ابوعبید القاسم بن سلام رحمہم اللہ سے مروی ومنقول ہے۔

(د) کسی سورت کی آیت نہیں: چوتھا مسلک امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کا ہے کہ بسملہ نہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ اس کے علاوہ دوسری سورتوں میں سے کسی کی: ”...... لیست آیة من الفاتحة ولا من غیرها من السور ......“، امام داؤد اور امام احمد بن حنبل کی آرا نقل کرنے کے بعد حافظ ابن کثیر نے یہ دل چسپ روایت نقل کی ہے کہ امام ابوبکر رازی نے امام ابوالحسن سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر سورہ کے آغاز میں لکھی گئی ہے اور موخر الذکر دونوں اکابر امام ابوحنیفہ کے اکابر اصحاب میں سے ہیں، اس طرح یہ چوتھا مسلک اولین مسلک کی تائید کرتا ہے کہ بسملہ ایک مستقل آیت کریمہ ہے جو ہر سورہ کے آغاز میں یا دو سورتوں کے درمیان میں فصل کرنے کے لیے شروع سے لکھی گئی ہے۔(ابن کثیر، تفسیر ۱/ ۱۶؛ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، تفسیر قرآن، تفسیر ماجدی، لکھنؤ، اشاعت ۱۹۹۵ء، ۱/ ۳۳، ص ۸)،

قرآن مجید کا یہ افتتاحی فقرہ بجز ایک سورت کے ہر سورت کی ابتدا میں دہرایا گیا ہے یعنی ۱۱۳ بار اور سورۃ النمل کے اندر عبارت میں بہ طور آیت قرآنی بھی آیا ہے اور اس لیے اس کے جز وقرآن ہونے نہ ہونے کی بابت تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، البتہ گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ آیا ہر سورت کی ابتدا میں بھی اس کی حیثیت بہ طور ایک مستقل آیت کے ہے؟ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ نہیں بلکہ یہ سورتوں کے درمیان محض بہ طور علامت فرق وتمیز کے اور ہر سورت کے شروع میں

بہ طور افتتاحی فقرہ کے ہے، امام مالک بھی اسی مسلک سے متفق ہیں: ''قال مالک وابو حنیفۃ لیست فی اوائل السور بآیۃ وانما ھی استفتاح لیعلم بھا مبدء ھا (ابن العربی) مفصل بحث جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن میں موجود ہے......''۔

اختلافی مسئلہ کا حل: نظریات سازوں اور حاملین مسالک نے اس اختلاف کا حل اپنی فقہی بصیرت کے مطابق نکال لیا لیکن قرآن مجید کی اس اہم ترین آیت کریمہ کی حیثیت، منزلت، مصحف میں یا سورتوں میں اس کا مقام ومرتبہ متعین نہ ہوسکا، آج بھی وہ اختلافی مسئلہ ہے اور سوائے فقہی ومسلکی حل کے، جو صرف گوناگوں ہی نہیں متضاد ومتصادم ہیں، قطعی صورت نہیں، بایں ہمہ اصول ترجیح کے مطابق ان مختلف نظریات، آرا وافکار میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جاسکتی ہے اور دی جانی چاہیے، تاکہ قرآن مجید کے متن الٰہی کی قطعیت کو اسی طرح ثابت کیا جاسکے جس طرح مختلف سورتوں اور ان کی آیتوں کی قطعی تعیین کی جاتی ہے۔

بلاشبہ ان مختلف نظریات اور متصادم اقوال وخیالات کے پیچھے ہر ایک نے حدیث یا قیاس کا پشتہ لگایا ہے لیکن بہرحال اپنے اپنے قیاسات اور ان پر مبنی استنباطات کو سہارا دینے کے لیے کسی نہ کسی حدیث واثر کا سہارا لیا ہے، مسئلہ کا حل مجموعی تناظر میں نکالا جاسکتا ہے جو تمام متعلقہ احادیث وآثار اور صحابہ کرام کے تعامل واقوال پر مبنی واستوار ہو، کیوں کہ یہی تمام اختلافات کو حل کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور قرآن وحدیث اور تعامل واجماع صحابہ کی طرف رجوع پر سب متفق ہیں، رہے اقوال وآرا مفسرین یا استنباطات وقیاسات پر مبنی فقہا کے اقوال ونظریات تو ان کی قطعیت کا کوئی قائل نہیں۔

بسملہ کے سورتوں سے قبل یا سورتوں کے درمیان رکھنے یا لکھنے کا کوئی حتمی قول وفرمان نہیں مل سکا ہے، ورنہ اس مسئلہ کا حل نکل آتا بلکہ وہ مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا، سورتوں کی ترتیب باہمی اور ان کی اندرونی آیات کریمہ ترتیب وتنظیم کا معاملہ قطعی وحتمی اور بلا اختلاف ہے لیکن بہرحال بعض احادیث ملتی ہیں جو سورت کے ساتھ بسملہ کے ربط وارتباط کی کوئی نہ کوئی شکل بتاتی ہیں، ان احادیث صحیحہ کی بنا پر ایک رائے قائم کرکے اس کا حل نکالا جاسکتا ہے، دوسری وہ روایات حدیث ہیں جن کے مطابق رسول اکرمؐ نماز میں سورتوں کی قرأت فرماتے تھے، وہ بھی ایک معیار عدل ہیں۔

اسباب نزول سے متعلق احادیث میں بعض سورتیں: ایک دل چسپ واتفاقی شہادت یہ ملتی ہے کہ قرآن مجید کی بعض سورتوں کے نزول کے اسباب سے متعلق صحیح احادیث مروی ہیں، ان احادیث نبوی سے سورت سے بسملہ کے تعلق وارتباط کو جانا جاسکتا ہے:

- اولین نازل ہونے والی سورہ اقرأ کی آیات کریمہ سے قبل بسملہ کا ذکر ابھی تک کسی حدیث میں نہیں مل سکا۔
- سورۂ فاتحۃ الکتاب کی قرأت، تنزیل اور تلاوت کے بارے میں متعدد احادیث ہیں:

(۱) رسول اکرمؐ کی مشہور حدیث قدسی ہے کہ سورۂ فاتحہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان برابر برابر تقسیم فرمایا، نصف اللہ کے لیے ہیں اور نصف بندوں کے لیے، اس سورہ کا آغاز الحمد للہ رب العالمین سے ہوتا ہے، ملک یوم الدین تک تین آیات اللہ کے لیے ہیں اور چوتھی دونوں معبود وعبد میں مشترک ہے اور بقیہ تین بندوں کے لیے ہیں، اس میں بسملہ سے آغاز نہیں فرمایا۔ (حدیث ترمذی: ۲۹۵۳)

سورۂ فاتحہ کے فضل، نزول، قرأت سے متعلق جتنی احادیث کریمہ ہیں ان میں سے کسی میں بھی بسملہ سے آغاز نہیں ملتا۔

(۲) حضرت ابی بن کعبؓ کو قرآن کی عظیم ترین سورت سکھائی اور الحمد للہ رب العالمین سے آغاز فرمایا۔ (بخاری، حدیث: ۴۴۷۴، اطراف: ۴۶۴۷، ۴۷۰۳، ۵۰۰۶؛ حدیث ترمذی، فتح الباری ۸/۱۹۶ ومابعد)

- سورہ اخلاص کی فضیلت وقرأت ونزول کے بارے میں متعدد احادیث ہیں اور سب کا آغاز بغیر بسملہ کے ہوتا ہے۔ حدیث ترمذی: ۲۸۹۵، ثلث القرآن، نیز ۲۸۹۶-۲۹۰۱ وغیرہ؛ حدیث ترمذی: ۳۳۶۴-۳۳۶۵ وغیرہ کے مطابق مشرکین عرب نے رسول اکرمؐ سے اپنے رب کے نسب کو ظاہر کرنے کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ''قل ھو اللہ احد'' تا آخر اتاری، نیز فتح الباری ۸/۹۴۴ ومابعد بحوالہ ترمذی وطبری، ابن خزیمہ وحاکم، ابویعلیٰ، طبرانی (الاوسط)
- حدیث ترمذی: ۲۹۰۲ وغیرہ کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات کریمہ نازل کی ہیں کہ ان کی مثال نہیں دیکھی گئی اور پھر آپؐ نے ''قل اعوذ برب الناس''

آخر سورہ تک اور "قل اعوذ برب الفلق" آخری سورہ تک پڑھی، حدیث مذکورہ بالا میں معوذ کی یہی برعکس ترتیب دی گئی ہے، جب کہ مصحف کی ترتیب میں سورۂ فلق پہلے ہے، ان دونوں کے آغاز میں رسول اکرمؐ کے بسملہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے، نیز حدیث ترمذی: ۳۳۶۷ میں بھی یہی ترتیب ہے۔

- سیرت نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ جب رسول اکرمؐ کے خطبہ صفا کے بعد حقیقی چچا ابوطالب ہاشمی نے رسول اکرمؐ کی دعوت ٹھکرا دی اور مجلس برپا کرنے پر سخت سست کہا تو اللہ تعالیٰ نے "تبت یدا ابی لهب وتب" اتاری، حدیث ترمذی: ۳۳۶۳؛ حدیث بخاری: ۴۹۷۳، فتح الباری ۸/۹۴۲-۹۴۴۔

- آخری کامل و مکمل سورت نازل ہونے والی تھی، سورۃ النصر، امام بخاریؒ نے سورۃ "اذا جاء نصر اللہ" کا عنوان باب باندھ کر حدیث: ۴۹۶۷ میں حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ "اذا جاء نصر اللہ والفتح" کے نزول کے بعد آپؐ ہر نماز میں "سبحانک ربنا و بحمدک اللھم اغفرلی" ضرور پڑھا کرتے تھے، رکوع و سجود کی تسبیحات گوناگوں میں سے حضرت امام نے صرف اسی تسبیح کا ذکر اپنی کتاب الصلوۃ میں کیا ہے، نیز حدیث: ۴۹۶۸۔

ایسی تمام احادیث وسنن کا احاطہ و استقصا کرنا مقصود نہیں ہے مگر ان سے صرف دکھانا مطلوب ہے کہ رسول اکرمؐ جب بھی نماز میں قرأت سورہ فرماتے تھے تو سورہ کے اولین الفاظ یا اولین آیت سے آغاز فرماتے تھے، بسملہ سے نہیں، اسی بناپر مشہور حدیث نبوی بھی ہے اور خلفائے ثلاثہ کا تعامل بھی کہ وہ نماز میں "الحمد للہ رب العالمین" سے جہری تلاوت کا آغاز فرماتے تھے اور بسملہ سے نہیں کرتے تھے، ایسی متعدد احادیث کتب حدیث میں ملتی ہیں۔

نماز میں قرأت نبوی کی احادیث: مختلف نمازوں میں رسول اکرمؐ کی مختلف سورتوں کی قرأت اور اس کی کیفیت کا ذکر احادیث میں ملتا ہے، ان میں سنت و استحباب کا معاملہ بھی ہے لیکن اس سے زیادہ صحیح قرأت قرآن کریم کا معاملہ بھی ہے، مختلف صحابہ کرام نے مختلف سورتوں کی قرأت نبوی نماز میں سنی تھی، ان میں سے صرف ان احادیث صحیحہ سے تعرض کیا جارہا ہے جن میں سورتوں کے آغاز کا واضح حال موجود ہے یا اس کا پکا قرینہ ہے، اگر عام قرأت نبوی میں بعض

ایسی سورتوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو صحابہ کرام نے سماعت کی تھیں مگر ان میں امکان پایا جاتا ہے کہ بسملہ وہ نہ سن سکے ہوں۔

سورۂ فاتحہ کی نماز میں قرأت خاص اور دوسری سورتوں کی قرأت عام کی نبوی کیفیت کا ذکر خاص ہے، رسول اکرمؐ کی عادت شریفہ اور سنت مستقرہ تھی کہ ٹھہر ٹھہر کر، ترتیل کے ساتھ ایک ایک آیت پڑھتے تھے اور ہر ایک آیت کریمہ کی تلاوت کے بعد وقف فرماتے تھے، ام المومنین ام سلمہؓ سے مروی حدیث ترمذی: ۲۹۲۷ میں سورۃ الحمد کی قرأت نبوی کا آغاز "الحمد للہ رب العالمین" سے ہوتا ہے، بسملہ سے نہیں: "......كان رسول الله ﷺ يقطع قرأته يقرأ: الحمد لله رب العالمين، ثم يقف، الرحمن الرحيم، ثم يقف، وكان يقرؤها ملك يوم الدين"۔

بسملہ سے قرأت نبوی کا بالجہر پڑھنا: دوسری طرف متعدد احادیث میں یہ تصریح ملتی ہے کہ رسول اکرمؐ نے قرأت کا آغاز بسملہ سے کیا، حافظ ابن کثیر نے سورۂ فاتحہ کی قرأت نبوی کے ضمن میں بسملہ کے ساتھ سورۂ فاتحہ کا آغاز کرنے کی بعض روایات جمع کردی ہیں اور متعدد صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین کا مسلک بھی بتایا ہے کہ وہ بسملہ کو بالجہر نماز میں پڑھا کرتے تھے، پہلے احادیث نبوی:

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اکرمؐ نماز کا افتتاح بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کرتے تھے۔

امام حاکم نے اپنی مستدرک میں اسی سند سے بیان کیا ہے کہ آپؐ بسملہ کو زور سے پڑھتے تھے۔

بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث ہے کہ رسول اکرمؐ اپنی قرأت کو کھینچ کر کرتے تھے "کان قرأته مدا"، پھر انہوں نے کھینچ کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی، یعنی اس کے تینوں اجزا کو باری باری سے۔

حضرت ام سلمہؓ کی حدیث مسند احمد، سنن ابی داؤد، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں ہے، جس کے مطابق رسول اکرمؐ اپنی قرأت میں تقطیع فرماتے تھے: بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین ...... الخ۔

بسملہ کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ بالجہر پڑھنے کا مسلک صحابہ کرام میں حضرت ابوہریرہ، ابن عمر،

ابن عباس اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، امام ابن عبد البر اور امام بیہقی نے حضرات عمرؓ و علیؓ سے اسی کو نقل کیا ہے اور خطیب بغدادیؒ نے خلفائے اربعہ کا یہی مسلک بتایا ہے، جو غریب ہے۔

تابعین میں حضرات سعید بن جبیر، عکرمہ، ابو قلابہ، زہری، علی بن حسین اور ان کے فرزند محمد، سعید بن المسیب، عطاء، طاؤس، مجاہد و سالم وغیرہ سے اسی مسلک کو نقل کیا گیا ہے۔

ائمہ مجتہدین میں امام شافعیؒ کا مسلک ہے کہ بسملہ سورۂ فاتحہ کی اولین آیت ہے، اس لیے سورۂ فاتحہ کے ساتھ اس کی بھی جہری تلاوت ہوگی، ان کے اصحاب اور بعض دوسرے سلف و خلف کا بھی یہی مسلک ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ۱/۱۶، ۱۷)

بسملہ کا ترکِ قرأت: اس سلسلے کی وہ احادیث و روایات بہت اہم اور معنی خیز ہیں جن میں یہ بیان ملتا ہے کہ کبھی جہری قرأتِ فاتحہ میں بسملہ کی قرأت ترک کردی گئی اور کبھی اس کی قرأت بالجہر کی گئی اور وہ ایک ہی صحابی جلیل سے مروی ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امام ابو عبد اللہ الشافعی اور حاکم نے مستدرک میں حضرت انسؓ سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مدینہ میں نماز پڑھی تو بسملہ ترک کردی، جب حاضر مہاجرین کرام نے ان کے اس عمل پر نکیر کی تو دوسری نماز میں انہوں نے بسملہ پڑھی، یہ اس باب کی معنی خیز روایت کے علاوہ فیصلہ کن بھی ہے اور اس پر بحث آتی ہے۔

سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسملہ کی جہری قرأت ترک کرنے کا مسلک بھی متعدد صحابہ و تابعین سے ثابت ہے، بلکہ وہ کسی سورہ کے ساتھ بھی نماز میں بسملہ کی جہری قرأت نہیں کرتے تھے، یہ حضرات خلفائے اربعہ، عبد اللہ بن مغفل اور صحابہ و تابعین کے سلف و خلف سے ثابت ہے اور یہی فقہی اماموں میں ابو حنیفہ، ثوری اور احمد بن حنبل کا مسلک ہے۔

امام مالک کا مسلک سب سے جداگانہ ہے کہ بسملہ کو نماز میں نہ تو جہری پڑھا جائے گا اور نہ سری، ان کی سند و استناد صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اکرمؐ نماز کا افتتاح تکبیر سے کرتے تھے اور اس کے فوراً بعد الحمد للہ رب العالمین کی قرأت کرتے تھے، اسی طرح صحیحین میں حضرت انس بن مالک سے مروی ایک حدیث ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ اور حضرات خلفائے ثلاثہ ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی اور وہ سب الحمد للہ

رب العالمین سے افتتاح کرتے تھے اور مسلم میں یہ بھی ہے کہ وہ بسملہ کو شروع قرأت میں پڑھتے تھے اور نہ آخر میں اور اسی کے مانند سنن میں حضرت عبد اللہ بن مغفل سے مروی ہے اور یہی تمام ائمہ مجتہدین کے مآخذ ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر، ۱/۱۷)

بسملہ کی قرأت کرنے اور نہ کرنے کی حقیقت: مذکورہ بالا تمام مسالک صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے تجزیے سے حقیقت کے کئی اطراف واضح ہوتے ہیں:

سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسملہ کی قرأت کا بھی معمول رہا ہے، بسملہ کی قرأت ترک کرنے کا مسلک بھی تھا، ایک ہی صحابی نے کبھی قرأت کی اور کبھی بسملہ ترک کردی، روایات کا اختلاف بتاتا ہے کہ صحابہ و تابعین اور دوسرے سلف و خلف میں متعدد نے بسملہ کی قرأت کی، مگر ان ہی بزرگوں سے یہ بھی دوسری روایات میں موجود ہے کہ انہوں نے بسملہ کی قرأت نہیں کی، رسول اکرمؐ سے اسی طرح دونوں مسالک قرأت اور ترک قرأت بسملہ کے منقول ہیں۔

ان تمام احادیث و روایات میں سے جن پر کلام کیا گیا ہے ان کو چھوڑ کر بقیہ کی صحت ثابت کی گئی ہے اور ان صحیح احادیث و روایات میں ہی قرأت بسملہ اور ترک قرأت بسملہ دونوں بظاہر متضاد و متصادم واقعہ مذکور ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ:

بسملہ سورۂ فاتحہ کی اولین آیت کریمہ نہیں ہے، بسملہ ہر سورہ کی مانند صرف افتتاح اور فصل کی آیت ہے، لہٰذا کبھی اس کو فاتحہ یا سورہ کے ساتھ پڑھا گیا اور کبھی نہیں پڑھا گیا، بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ:

(۱) احادیث و تعامل صحابہ سے تمسک مجتہدین ان کے ذوق پر مبنی ہے، کسی خاص دینی اور تشریعی اور واقعی استناد پر نہیں یا بہ قول خاکساران کے شیوخ کی تعلیم و تربیت اور ترجیح کا شاخسانہ ہے، (۲) کبھی بسملہ پڑھنا اور کبھی چھوڑنا ثابت کرتا ہے کہ وہ سنت کی متنوع وجوہ کا معاملہ ہے: ایک وجہ قرأت ہے اور دوسری وجہ ترک ہے۔ (مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب: سنتوں کا تنوع - ہر سنت نبوی افضل ہے، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء)

(باقی)

ماحولیاتی بحران، اسباب و علاج

(سائنس اور قرآن کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ)

پروفیسر سید مسعود احمد ☆☆

دور جدید کا اہم ترین عالمی مسئلہ جس پر اتفاق رائے ہو چکا ہو اور جس کا تعلق براہ راست جدیدیت (Modernism) ☆ سے بھی ہو، وہ صرف ماحولیاتی بحران کا مسئلہ ہے، مزید برآں اس مسئلہ کا تعلق صرف انسانوں سے ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں پائے جانے والے سارے جانداروں اور ان سے بھی آگے بڑھ کر سارے موجودات تک محیط ہے، علاوہ بریں یہ بحران (Crisis) نہ صرف زمانہ حال تک محدود ہے بلکہ مستقبل قریب کا ایک عظیم مسئلہ بن کر ابھر رہا ہے، بالفاظ دیگر یہ مسئلہ نہ صرف موجودہ دنیائے رنگ و بو سے خراج وصول کر رہا ہے بلکہ اس کرۂ ارضی کی آئندہ نسلیں اس سے متاثر ہوتی رہیں گی۔

اس مقالہ میں ہم ماحولیاتی بحران (Environmental Crisis) کے مختلف مظاہر، اس مسئلہ کے ذمہ دار عوامل و اسباب اور اس بحران کے اسلامی حل کے متعلق معروضات پیش کریں گے، موضوع خاصا وسیع الاطراف (Multifaceted & Multidimensional) ہے، اس لیے کوشش یہ کی گئی ہے کہ غیر ضروری تفصیل و مباحث سے گریز کرتے ہوئے موضوع کے ناگزیر گوشوں ہی پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔

زیر نظر موضوع اصطلاحی ماحولیات (Environment as Scientific term) ہے

☆ یہاں ہم نے جدیدیت یا ماڈرنزم کو اصطلاحی مفہوم ہی میں استعمال کیا ہے جس کی اپنی تعریف و تاریخ ہے اور جس کا ردعمل مابعد جدیدیت یا پس جدیدیت ہے، ان کی وضاحت مناسب مقام پہ کی جائے گی۔

☆☆ شعبہ بایو کیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

بحث کرنا ہے، جو نہ صرف عصری سائنس کا ایک مستقل مضمون تدریس و تحقیق ہے بلکہ ماحولیاتی بحران پر سائنسی تحقیقات عصر حاضر میں حکومتوں کے ترجیحی امور (Thrust areas) میں شامل ہیں، سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ جدیدیت بہ عنوان صنعتی انقلاب کا ایک ناگزیر شاخسانہ ہے، بالفاظ دیگر دور جدید جن سائنسی ترقیوں (؟) کا مرہون منت ہے، ماحولیاتی بحران اسی نام نہاد سائنس کے کڑوے کسیلے پھل کا ایک ادنی مظہر ہے، انہیں وجوہات کی بنا پر ماحول (Environment) کی سائنسی تعریف (Scientific Definition) پر مبنی معروضات ہی پیش کریں گے، تاکہ اس پہلو سے کسی اعتراض کی گنجائش نہ نکل سکے۔

ماحول (Environment) اپنی سائنسی تعریف کے مطابق کسی چیز (Organism) کے ارد گرد اثر انگیز طبیعیاتی، کیمیاوی اور حیاتیاتی کیفیات و عوامل نیز اجزا کا نام ہے (۱)، انگریزی میں (Environment) کا مادہ فرانسیسی سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں احاطہ کرنا یا ڈھک لینا، کرۂ ارض کے ارد گرد حلقہ ہائے خصوصی زمین کے مادی ماحول (Atmosphere) سے عبارت ہیں، اس مادی ماحول (Material Environment) میں ایک طرف گرد و پیش کے جاندار شامل ہیں تو دوسری طرف غیر نامیاتی اشیا مثلاً سورج کی شعاعیں، پانی، آکسیجن، معدنیات اور جانداروں کے فضلے آتے ہیں، یہ معلومات بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوں گی کہ ہماری زمین پر پائے جانے والے مختلف النوع جاندار سمندر کی تلی سے بیس پچیس کلومیٹر کی بالائی فضا تک عموماً ملتے ہیں، یہ حیاتیاتی پرت (Biosphere) کہلاتی ہے اور غیر حیاتیاتی معدنی پرت (Lithosphere) اور آبی پرت (Hydrosphere) اور بالائی فضائی پرت (Atmosphere) کے ناموں سے موسوم ہیں، یہ فضا ایک ہزار کلومیٹر کی اونچائی کے بعد اتنی لطیف ہو جاتی ہے کہ اس کو خلا (Space & Vacuum) ہی سمجھا جاتا ہے، اس فضائی کرہ میں بھی کئی طرح کی پرتیں پائی جاتی ہیں جن کو بہ تدریج Stratosphere, Troposphere اور Ionosphere وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے (۲)، سطح زمین سے بیس تا اسی کلومیٹر کی پرت جو اسٹریٹو اسفیر (stratosphere) سے موسوم ہے، اس میں آکسیجن کی ایک مخصوص شکل جسے اوزون (Ozone) کہتے ہیں خاصی تعداد میں موجود رہتی ہے، اوزون بہ ذات خود ایک زہریلی گیس ہے مگر باذن اللہ بالائے بنفشی (Ultra-Violet Rays) شعاعوں کو جذب

کر کے حیاتیاتی پرت (Biosphere) کے لیے اوزون پرت ایک سقف محفوظ کا رول ادا کرتی ہے جس سے خشکی وتری میں پائے جانے والے جملہ جاندار ان شعاعوں کے مہلک اثرات سے بچے رہتے ہیں اور اس طرح اوزون پرت (Ozone Layer) کی موٹائی پر حیاتیاتی پرت کی بقا کا انحصار ہے۔

اس طرح زیر بحث موضوع پر تمہیدی کلمات ناقص رہیں گے جب تک کہ ماحولیاتی نظام یعنی اکالوجی (Ecology) کی چند بنیادی باتیں سامنے نہ رہیں، اکالوجی سائنس کی اس شاخ کا نام ہے جو جانداروں کے درمیان تعامل نیز ان کے اور مادی ماحول کے مابین رشتوں سے بحث کرتی ہے (۳) اس ماحولیاتی نظام کی حرکی اور تفاعلی اکائیاں (Functional Units) اکوسسٹم (Ecosystem) کہلاتی ہیں، ہر چھوٹے بڑے علاقہ کا ایک مخصوص اکوسسٹم ہوتا ہے جس میں قدرتی دائراتی تغیرات (Natural Cycles) کے ذریعہ لطیف توازن (Delicate Balance & Equilibrium) قائم رہتا ہے اور یہ دائراتی نظام (Natural Cycles System) زمین کے لکھوکھا خوردبینی اور غیر خوردبینی جاندار قائم رکھتے ہیں اور ہر ایک جاندار دوسرے جاندار نیز غیر جاندار اشیا سے ایک طرح کا غذائی تعلق اور بقائی انحصار قائم کیے ہوئے ہے، مثلاً پیڑ پودے حیوانات کی غذا ہیں تو چھوٹے حیوانات بڑے حیوانات کی غذا، دوسری طرف حیوانات کے فضلے پیڑ پودوں کی غذا، اس طرح غذائی زنجیر یا فوڈ چین (Food Chain) اور غذائی جال یا فوڈ ویبس (Food Webs) قائم ہیں، ان میں سے اگر ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو ماحولیاتی عدم توازن (Ecological Imbalance) پیدا ہو جائے گا اور حیاتیاتی تنوع (Ecological & Biological Diversity) متاثر ہوگا، مثال کے طور پر شیر اور چیتے کے خاتمہ سے ہرن اور نیل گائے وغیرہ جانوروں کی زیادتی ہو جائے گی اور یہ جنگل ہی سبزہ وگھاس کا مکمل صفایا کردیں گے، گھاس سے زمین کی روئیدگی بھی قائم رہتی ہے اور اس کی جڑوں سے نیچے کی مٹی بھی جمی رہتی ہے، نیز خاطر خواہ سبزہ زہریلی کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کو حیات بخش آکسیجن میں تبدیل کر کے اس سائکل میں توازن قائم کرنے کا سبب بنتا ہے اور اس سے موسم اور درجہ حرارت اور ہوائیں اور بارش اور نہ جانے کیا کیا قدرتی نظام قائم رہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ دست قدرت کے بجائے ناقص العقل انسان کے ہاتھوں شیر اور چیتے کا بے تحاشہ

شکار خود انسانی زندگی پر جو ستم ڈھائے گا اس کا تصور محال ہے، شیر اور چیتے کا ذکر تو ہم نے بہ طور مثال پیش کیا ہے ورنہ قدرتی نظام توازن میں کوئی بھی ذرہ برابر تبدیلی کرۂ ارضی کو جن خطرات سے دوچار کردے گی، اس کا تفصیلی جائزہ سپر کمپیوٹر (Super-Computer) تک لینے سے قاصر ہیں اور جن اثرات سے انسان ابھی ناواقف ہے ان تک تو کمپیوٹر کا مصنوعی ذہن بھی کیا پہنچے گا، موسمیات سے متعلق ننانوے فیصد معلومات انسانی ذہن کی رسائی سے باہر ہیں اور کمپیوٹر کی بے مثال ترقی کے باوجود ان پیشین گوئیوں کا حال ہر خاص و عام پر واضح ہے، ہم یہاں جو حقیقت حال پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ماحولیاتی نظام توازن کی وہ پیچیدگی ونزاکت ہے جس کے سلسلہ میں ذرہ برابر کم علمی یا تکنیکی نقص مہلک ثابت ہوتا ہے کجا یہ کہ صنعتی انقلاب کے نام پر ماحولیاتی عدم توازن سے جانتے یا ان جانے آنکھیں موند لی جائیں جس طرح شتر مرغ کے ریت میں سر چھپانے سے طوفان نہیں ٹلتا اور آخر کار وہی ہوکر رہا جس کا خدشہ تھا، کاش دنیائے انسانیت یاد رکھتی کہ فرعون وقت کا "انا ربکم الاعلی" کا نعرہ اور قارون وقت کا "علی علم عندی" کا استدلال اور شداد کا دنیوی جنت کا خواب اور نمرود کا "انا اُحیِ وَ اُمیت" کا بچکانہ انداز ان کی ہلاکت کا سبب بنا اور ان کے ظلم کا وبال دنیا نے دیکھا اور تاریخ نے محفوظ رکھا اسی طرح استحصال قدرت اور خدا بیزاری پر مبنی سائنس وٹیکنالوجی کا وبال مشیت ایزدی میں مکتوب ومرقوم تھا اور کتاب مقدس بہ بانگ دہل پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ "ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا" (فتح ۲۳؛ فاطر ۴۳) کہ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہ بات الگ ہے کہ آج بھی ان کے شاگرد اس جرم کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کا وبال وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جس سے انکار کی کسی کو مجال نہیں، ان کا یہ خیال خام ہے کہ جو کچھ ہوا کم علمی اور تکنیکی نقص ہی کا نتیجہ تھا اور اس خامی پر ہم جلد ہی قابو پالیں گے اور گویا تکمیل علم کی سند حاصل کرلیں گے مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جس دن انہوں نے یہ دعوا کیا وہ بہ ذات خود سائنسی تحقیقات کی موت کا اعلان ہوگا اور اس سے اہم یہ حقیقت ہے کہ انسان مابعد الطبیعیاتی حقائق (Mataphysical Truths) سے انکار کرکے حقیقی ترقی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد نفس مسئلہ کے تاریخی پہلوؤں اور چند نمایاں مظاہر پر غور

کریں، جیسا کہ اشارتاً عرض کیا جاچکا ہے کہ ماحولیاتی بحران کی جڑیں یوں تو مغربی سائنس کے فلسفہ اور اس کے تاریخی پس منظر نیز اس کے طریق تحقیق (Methodology) میں پیوست ہیں جس میں انسانی عقل اور سائنس دونوں اس مقام پر فائز ہوجاتے ہیں، جس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور جس فلسفہ کی رو سے سائنسی وتکنیکی انقلاب کا مقصد فطرت کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی کے بجائے اس کی استحصالی تسخیر (Exploitative Subjugation & Query) تھا، دراصل اس موہوم نظریہ پر مبنی تھا کہ انسانیت کے سارے مسائل سائنس حل کرسکتی ہے مگر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے درمیان سے صدی کے اختتام تک جراثیم کش دواؤں کے خطرات پر راشیل کارسن (Rachel Carson)(۴) کی کتاب (Silent Spring) کے بعد ماحولیاتی بحران کا شعور کچھ اس طرح زور پکڑتا گیا کہ اقوام متحدہ کی ایک باقاعدہ کانفرنس ۱۹۷۲ء میں اسٹاک ہوم میں بلائی گئی، پھر دوسری عالمی کانفرنس دس سال بعد ۱۹۸۲ء میں نیروبی میں ہوئی، پھر تیسری عالمی کانفرنس جون ۱۹۹۲ء میں برازیل کے شہر ریوڈی جیارو میں دنیا کے سیاسی ذمہ داروں (Heads of the Nations) کی ہوئی جس میں ستائیس اصولوں پر مبنی ماحولیاتی مسائل کے تعلق سے حقوق وفرائض کا ایجنڈا نمبر اکیس (۵) طے پایا اور اس کے بعد سے آج تک نہ جانے کتنی چھوٹی بڑی کانفرنسیں منعقد ہوچکی ہیں جن کا مقصد اس ماحولیاتی بحران سے چھٹکارا پانا ہے۔

اس بحران کے مظاہر تو بے شمار ہیں مگر اس کے پانچ بڑے مظاہر مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں پیش کیے جاسکتے ہیں:

۱- ماحولیاتی بحران (Environmental Crisis) کا سب سے خطرناک ظہور کرۂ جاتی اضافہ حرارت (Global Warming) کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور اس کو بعض لوگ گرین ہاؤس افیکٹ (Green House Effect) بھی کہتے ہیں، اس کی وجہ سے سیلاب، قحط، طوفان، نشیبی علاقوں کی سمندری غرقابی (Inundation of Coastal Areas)، موسمی عدم توازن اور متعدد ان دیکھے خطرات کے اندیشے بڑھ گئے ہیں۔

۲- دوسرا بڑا مسئلہ اوزون پرت (Ozone Layer) کی ضخامت میں کمی یا اوزون چھید (Ozone Hole) کا نمودار ہونا ہے، اس حفاظتی نظام الٰہی سے جو سقف محفوظ کا ایک ادنیٰ

مظہر ہے، اس کرۂ ارضی کی حیوانی، انسانی اور نباتاتی نشو ونما اور صحت کا دارومدار ہے جس کے متاثر ہونے سے قدرتی سائیکل بگڑیں گے اور نہ صرف ماحولیاتی عدم توازن پیدا ہوگا، بلکہ کینسر، جلدی امراض، قوت مدافعت میں کمی اور حیاتیاتی نشو ونما میں خطرناک تبدیلیاں تحقیق شدہ مسائل میں سے ہیں۔

۳- ماحولیاتی بحران کا تیسرا بڑا مظہر ماحولیاتی آلودگی میں مہلک ترین اضافہ ہے، یہ قدرتی ماحول (Natural Environment) میں انسانی دست درازی سے عبارت ہے جس سے ایک مصنوعی ماحول (Artificial Environment) وجود میں آیا ہے، کروڑوں سال سے جاری وساری قدرتی سائیکل (Natural Ecological Cycles) کو مصنوعیات نے توڑ کر رکھ دیا ہے، نت نئی کیمیاوی ایجادات نے کیمیاوی آلودگی، انسان کی بے پناہ خواہش نے نیوکلیر اور اٹامک آلودگی، انسان کی غلام اور بہ ظاہر آرام دہ مشینوں نے اس دنیا کی خاموشی اور فرحت انگیز برودت چھین کر شور وشغب اور گرمی سے ان کو دیگر حیوانات کو ذہنی اور جسمانی مریض بنادیا ہے، اس آلودگی سے نئے امراض وجود میں آرہے ہیں اور پرانے امراض پر قابو پانا مشکل ہوگیا ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ حیوانی اور نباتاتی نشو ونما متاثر ہوکر اور نت نئے کیمیاوی اور طبیعیاتی فضلے (Chemical & Physical Wastes) جمع ہوکر اس کرہ ارضی کو ایک متعفن وزہریلے گھورے (Wastepit) میں تبدیل کردیں گے جس میں حیات وروئیدگی داستان پارینہ بن جائے گی۔

۴- ماحولیاتی بحران کا چوتھا بڑا مظہر ماحولیاتی عدم توازن (Ecological Imbalance) کا براہ راست ظہور ہے، جس سے حیاتیاتی تنوع (Biological Diversity) متاثر ہوکر فوڈ چین اور فوڈ ویب کی اہم کڑیاں صفحۂ ہستی سے غائب ہورہی ہیں، اس کے نتائج کیا ہوں گے اس کے لیے تمہیدی بحث میں شیر اور چیتے کے غائب (Extinction) ہونے سے ممکنہ خطرات کا تصور کرلیجیے۔

۵- پانچواں اہم مسئلہ جو مستقبل سے زیادہ تعلق رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ تکنیکی ترقی کی جو رفتار بیسویں صدی میں قائم ہوئی اس کو برقرار رکھنے کی شکل کیا ہو جب کہ موجودہ تکنیکی ترقی کے ساتھ آلودگی (Pollution) کا مسئلہ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، نیز مشینی ترقی کی دوڑ میں متبادل ایندھن کیا ہو جس سے ماحولیاتی عدم توازن کا خطرہ بھی نہ ہو اور کوئلے اور پٹرول کے

تیزی سے گھٹتے ذخائر سے سماجی اور اقتصادی بحران بھی نہ پیدا ہو، اس کو اصطلاحی طور پر انگریزی میں Ecological Sustainability اور Sustainable development of Energy & resources کہا جاتا ہے، یہ ایسی ٹیڑھی کھیر ہے جس کا جواب سائنسی قدروں کی تبدیلی میں مضمر ہے۔

نفس مسئلہ پانچ نکاتی میمورنڈم کی شکل میں پیش کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بنیادی اسباب کا ایک علمی جائزہ پیش کیا جائے۔

جیسا کہ تمہیدی گفتگو میں عرض کیا گیا کہ موجودہ سائنسی تحقیقات سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کرۂ ارض پر جاندار و غیر جاندار نیز اشیا اور ان کے ماحول (Organisms & their environment) کے درمیان بے مثال توازن (Equilibrium) پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر اگر آکسیجن گیس اشیا کے جلنے اور حیوانات کے سانس لینے میں خرچ ہوتی ہے تو پیڑ پودے اس کو خارج کر کے فضا میں تحلیل کرتے ہیں، اس کے ساتھ ہی کاربن ڈائی آکسائڈ جو حیاتیات کے فضلہ کی شکل میں خارج ہوتی ہے اس کو نباتات ارضی جذب کر کے آکسیجن میں تبدیل کرتے رہتے ہیں اور اس طرح آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کا یہ سائیکل یا نظام توازن کمال یکسانیت سے آج سے چار سو سال قبل تک بغیر کسی انسانی دست برد کے پوری آب و تاب سے چلتا رہا مگر جب سے صنعتی انقلاب کے نام پر مشینیں ایجاد ہوئیں اور ان کے لیے کوئلے کا اور پھر پٹرول کا استعمال شروع ہوا تو فضا میں فرحت بخش آکسیجن میں بہ تدریج کمی اور زہریلی کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ نہ صرف شہروں میں آلودگی سے گھٹن کا احساس بڑھا بلکہ موسمی غیر معمولی تغیرات عام ہوگئے ہیں اب خود سائنس داں یہ کہہ رہے ہیں کہ فضا میں بڑھتی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار حرارتی انجذاب کا غیر معمولی ملکہ رکھنے کی وجہ سے کرہ جاتی درجۂ حرارت میں اضافہ (Global Warming) کا بنیادی سبب ہے، جس سے ماحولیاتی عدم توازن کے دوسرے مظاہر بھی نمودار ہوگئے ہیں، سائنس دانوں کا یہ اعتراف گویا اپنی کم علمی، کوتاہ بینی اور صنعتی انقلاب کی نام نہاد ترقی کے پیچھے بدیہی مہلک نتائج کا اعتراف ہے، حالاں کہ اکثریت نے ابھی ہار نہیں مانی ہے اور وہ اسی نظام سائنس و ٹیکنالوجی میں اس مسئلہ کا حل ڈھونڈھنے کی ناکام کوششوں میں لگی ہوئی ہے، جب کہ مختلف جہات سے موجودہ سائنس

ٹیکنالوجی کی مبادیات پر کڑی ضربیں پڑ رہی ہیں۔

دوسرا بڑا مسئلہ اس نام نہاد سائنسی ترقی کا یہ رہا کہ انسانی فلاح و بہبود کے نام پر عیش کوشی اور آرام پسندی رواج پانے لگی اور انسانی راحت (Human Comfort) اور سائنسی ترقی لازم و ملزوم ہوگئے، یہاں تک بھی معاملہ قدرے غنیمت تھا مگر مغربی سائنس دانوں کی نام نہاد جدت پسندی بنام ایجادات نے یہ گل کھلائے کہ مصنوعیات کی قدر و قیمت فطریات سے کہیں آگے بڑھ گئی اور یہی ترقی کی معراج اور اس کی کسوٹی قرار پائی، اس راحت بنام ترقی بنام مصنوعیات کی ایک عمدہ مثال بیسویں صدی کی تیسری دہائی کی سنہری دریافت (۶) سی ایف سی ۱۱ اور ۱۲ ہیں، جب راحت کوشی نے ٹھنڈے پانی اور گرمی سے بچاؤ کی خاطر فرج اور ایر کنڈیشنرس کی ایجاد کے لیے سائنس دانوں کو اکسایا اور چند سالوں ہی میں جب فرج اور ایر کنڈیشنرس کی مانگ بڑھی اور کھپت میں زبردست اضافہ ہوا تو اس کے لیے سائنس دانوں کو امونیا گیس کے متبادل کی تلاش تھی، سی ایف سی ایسے وقت میں ایک نعمت غیر مترقبہ کی شکل میں دریافت ہوئی اور یہی CFCs بیسویں صدی کے اختتام سے بہت پہلے کرۂ فضا کی اہم ترین پرت کے لیے ملک الموت ثابت ہوئیں اور یہی معصوم صفت سی ایف سی کاربن ڈائی آکسائڈ سے دس ہزار گنا انجذاب حرارت کا ملکہ لے کر کرہ جاتی اضافۂ حرارت کے ایک چوتھائی اضافہ کی ذمہ دار قرار پائیں، مصنوعات کے ذریعہ انسانی راحت رسانی کا خدائی خراج کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے، اس کے سمجھنے کے لیے یہ مثال کتنی چشم کشا ہے۔

تیسرا نکتہ ماحولیاتی بحران کے تعلق سے یہ ہے کہ اس پورے بحران کا ذمہ دار انسان اور اس کا استحصالی رویہ ہے اور یہ مسئلہ اس کے بے جا عیش و آرام (Excessive and self - destructive human comfort) کے حصول کا قدرتی ٹیکس ہے اور اس کے اس وہم و تخیل اور کرتوتوں کی سزا ہے کہ اس زمین پر میں ہی مقتدر اعلا اور قدرتی ذخائر کا تنہا مالک و مختار ہوں، لہٰذا اس کرۂ ارضی کو جس طرح چاہوں تصرف میں لاؤں اور اپنے ناجائز آرام و آسائش اور حرص و اشتہا کی بجا آوری کے لیے فطرت (Nature) کا خوب استحصال کروں بلکہ تسخیر کائنات کا یہی مطلب ہے کہ میں مصنوعی بارش کے ذریعہ اپنی زمین کو سیراب کروں، مصنوعی کھادوں کے ذریعہ

زمین کی زرخیزی میں اضافہ کروں، ایٹم کی قوت جو مجھے حاصل ہوگئی ہے اس کا استعمال میں نہ صرف اپنے دشمنوں کے خلاف کروں بلکہ نظام فطرت جو مجھے ہر وقت چیلنج کرتا رہتا ہے اس قوت کے ذریعہ اس کو بھی کنٹرول کروں، فطرت کے تئیں جدیدیت (Modernism) کے علم برداروں کے اس طرح کے عزائم نے جن پر عمل درآمد کی ماضی میں کوششیں ہوتی رہیں، آج انسان کو اس مقام پر پہنچادیا کہ اس کو اپنے کرتوتوں کی سزا قانونِ مکافات اور قانونِ فطرت کے تحت بھگتنا ہی ہے، قوانین الٰہی کا ایسا زبردست (Glaring) مظاہرہ آج کی دنیا میں کم ہی نظر آتا ہے اور قرآن حکیم کی یوم الحساب کے تعلق سے سینکڑوں آیات کی حقانیت کا یہ منہ بولتا ثبوت ہے اور کون منکر آخرت قرآن مجید کی اس آیت پر لب کشائی کی جسارت کرسکتا ہے کہ " ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الروم: ۴۱) "، "خشکی اور تری میں فساد رونما ہوگیا ہے لوگوں کی اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ باز آجائیں"، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ آیت نزول قرآن کے وقت کے اخلاقی انحطاط کے تناظر میں ہے، اس سلسلہ میں یاد رہنا چاہیے کہ قرآن مجید قیامت تک کے لیے ہدایت کی آفاقی کتاب ہے اور ہم گزشتہ چند صدیوں کے انسانی رویوں پر اس آیت سے ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان رویوں اور نظریوں ہی کا نام فلاسفہ نے جدیدیت (Modernism) رکھا تھا، جس کی تعریف میں انسان پرستی (Humanism)، روشن خیالی، تعقل اور طبیعی سائنس (Natural Science) کی، روایت اور اتھارٹی پر بالاتری داخل تھی اور جس تحریک نے مذہبی محاذ پر الحاد و تشکیک کو جنم دیا اور جس کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم تھی کہ خودمختار فرد اور اس کی عقل ہی حقیقت اور سچائی کا سرچشمہ ہے (۷) مگر یہ مقام عبرت ہے کہ جدیدیت، مغرب میں جن بلند بانگ دعووں کے ساتھ قائم تھی اسی مغرب میں وہ آج اپنی بقا کی آخری جنگ لڑرہی ہے اور حالات شاہد ہیں کہ بہت جلد مابعد جدیدیت (۸) (Post-Medernism) کے آگے گھٹنے ٹیک دے، فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ، مگر اس بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مابعد جدیدیت انسانیت کے درد کا مداوا ہے یا انسانیت نے حق کو پالیا، دل چسپ بات تو یہ ہے کہ مابعد جدیدیت تو حق تک کو ایک "اضافی قدر" سمجھتی ہے اور یہ جدیدیت کا مکمل ردعمل ہے، نہ یہ

سائنس کو ایک حتمی سچائی سمجھتی ہے اور نہ جدیدیت کے عظیم بیانات (Meganarratives) کو کھلے فریب سے زیادہ سمجھتی ہے، پوسٹ ماڈرنزم کے نزدیک جدیدیت نے جن خود ساختہ سچائیوں کو تشکیل دیا ہے ان کو توڑنا (Deconstruct) ہی اس کا مقصد ہے۔ (۸)

چوتھا نکتہ ماحولیاتی بحران کے تعلق سے یہ ہے کہ موجودہ انسانیت خود اپنی آیندہ نسل کی دشمن بن کر کھڑی ہوگئی ہے، حالاں کہ عام طور سے انسان اپنی اولاد کی دنیا بنانے کی خاطر اصول تک توڑتا ہے اور بدنام ہوتا ہے، چنانچہ یہ حقیقت بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر مزمن سمیت (Slow Poisoning) کے ذریعہ نسل انسانی کے قتل کا مرتکب ہورہا ہے اور یہ خود غرضی کی انتہا ہے۔

اس پس منظر میں حضور نبی اکرمؐ کی اس حدیث مبارکہ کی صداقت کا یقین بڑھتا جارہا ہے کہ "جس سے حساب لیا گیا وہ مارا گیا" (بخاری و مسلم بہ روایت حضرت عائشہؓ) فی زمانہ ہر خاص و عام شخص کتنی نعمتوں کا استعمال کررہا ہے، کتنے لوگوں نے جائزہ لیا کہ انہوں نے یہ نعمتیں کائنات کے توازن، نسل انسانی کی بقا اور فطری حیاتیاتی تنوع کی قیمت پر حاصل کی ہیں اور رب کائنات کے کتنے احکامات کو پامال کیا ہے، ایک چھوٹی سی مثال پیش کی جاتی ہے، ہم موجودہ سائنس و ٹکنالوجی پر مبنی ایرکنڈیشنر کو استعمال کرکے اللہ تعالیٰ کے نظام توازن کو کس حد تک بگاڑ رہے ہیں اور اپنا اور تمام جانداروں کا نیز اس کرۂ ارضی کا آج کی معلومات کی روشنی میں کتنا بڑا نقصان کررہے ہیں، اندازہ کرنے کے لیے اس کی صرف ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

اس مصنوعی ٹھنڈک کو حاصل کرنے کے لیے وہ کنڈیشنر نہ صرف کمرہ کے باہر اس سے زیادہ مقدار میں گرم ہوا پھینکتا ہے جو اس کا نقد نقصان ہے جو بہ شکل خراج قدرت ہم سے وصول کرتی ہے، مزید برآں یہ کنڈیشنر جس بجلی سے چل رہا ہے وہ کسی نہ کسی ایندھن سے پیدا کی گئی ہوگی یا بندھ باندھ کر بنائی گئی ہوگی، تینوں ہی صورتوں میں خسارہ ہے، روایتی ایندھن (Fossil Food) کے جلنے سے کرہ جاتی اضافہ حرارت کا مسئلہ، نیوکلیر ایندھن سے تاب کار آلودگی کا مسئلہ اور بندھ باندھنے سے سیلاب اور زلزلہ کا اضافی خطرہ تو خاص مسائل کی شکل ہیں اور تینوں ہی صورتوں میں عام مسائل کی شکل میں ہمارے لیے، جملہ جانداروں کے لیے اور اگلی نسلوں کے لیے ایک طرف

ماحولیاتی آلودگی کی شکل میں تو دوسری طرف قحط، سیلاب، زلزلہ اور موسمی تغیرات جیسے قدرتی آفات کی شکل میں اور تیسری طرف کینسر جیسی لاعلاج بیماریوں کی شکل میں اس تھوڑی سی راحت سے کتنے گنا زیادہ مصیبت کے جال بن رہے ہوں گے اور ہماری اس معصوم خواہش کی تکمیل پر موجودہ ٹکنالوجی کے ذریعہ کتنا بھاری ٹیکس لگ جائے گا، اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں اور اگر اس نعمت کی قدر ان عصری آنکڑوں سے ناپی جائے تو "ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (التکاثر:۸) پھر تم سے اس روز نعمتوں کے تعلق سے باز پرس ہوگی" کی تفسیر اس واقعہ کی روشنی میں مزید واضح ہوتی ہے جو حضور نبی اکرمؐ نے فاقہ کے بعد کھجور کے چند خوشوں اور ٹھنڈا پانی پینے کے بعد اپنے جاں نثار ساتھیوں کے سامنے پیش فرمائی (۹) اور اس پر ان لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا تھا، جب کہ ہمارے سامنے حیرتوں کے پہاڑ ہیں، اس موقع پر ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ اس وقت کا ٹھنڈا پانی آج کے فرج کے پانی سے کافی گرم ہوتا تھا اور اس پانی میں فطرت کے کسی استحصال کو دخل نہیں تھا، نہ کسی قسم کی مصنوعیات کا استعمال اس میں شامل تھا، زیر غور معاملہ اتنا بھی آسان نہیں بلکہ ہمارے غلط افعال و اعمال جس کے نقصانات و نتائج کل پردہ راز میں مستور تھے، وہ ان کے برابر نہیں ہوسکتے جن کا علم آج دنیائے انسانیت کو ہوگیا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی مخصوص نظام کرم ہے کہ انسان کے ذہنی ارتقا اور اعمال کے بہ قدر کائنات کے رازہائے سربستہ کا انکشاف وہ رب کریم کرتا رہتا ہے، چنانچہ جب مصنوعات نہیں تھیں تو ان کے اندر چھپے ہلاکت خیز اثرات و نتائج کا علم بھی نہیں دیا گیا تھا اور جب انسان نے اپنی بے لگام خواہشات کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ کے نظام کو چیلنج کیا تو پھر اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے بے پایاں کرم سے اس کے عظیم نقصانات کو بھی دن کی روشنی کی طرح مبرہن کردیا، تاکہ انسان جو فیصلہ بھی کرے پورے عقل، شعور اور علم کی روشنی میں کرے اور اس کا ذمہ دار بھی وہ خود ہو۔

یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ماحولیاتی بحران کے ڈانڈے اس علم سائنس سے بھی جا ملتے ہیں جو اس نام نہاد ترقی کا باعث بنا اور ظاہر ہے کہ یوروپ کی سولہویں صدی عیسوی کے اس سائنسی اور عقلی انقلاب کے پس پردہ مذہب بیزاری بنام چرچ بیزاری جس کا مکمل ظہور خدا بیزاری کی شکل میں ہوا اور عقلیت زدگی بلکہ عقل پرستی اور احساس جواب دہی سے لاپرواہی اور الحادانہ

رویے تو اس سمت میں اہم کردار ادا کرہی رہے تھے (۱۰)، ان کے علاوہ بعض ایسے نظریات بھی پیش کیے جارہے تھے جو اس دہریت اور مذہب دشمنی کو تقویت پہنچاتے تھے، ان نظریات کے علم بردار فرانسیسی راجر بیکن، رینی دکارتے، گلیلی گلیلیو، آئزک نیوٹن اور چارلس ڈارون تھے جنہوں نے عرب سے مستعار مگر یورپ میں نشو و نما یاتی سائنس سے بنیادی اسلامی اصولوں (Fundamentals) اور اقدار کو دیس نکالا دے دیا اور مغربی سائنس کو ایک نئے تصور کائنات (World-View) اور مبادیات اور طریقہ کار (Methodology) سے آراستہ کیا، مادہ پرستی (Materialism)، عقلیت پرستی (Rationalism) اور نظریہ تقلیل یا تخفیف پرستی (Reductionism) اس نئی اور مسحور کن سائنس کے اجزائے ترکیبی اور نشان امتیاز تھے، مغرب میں سائنسی انقلاب کے ان معماروں پر قدرے تفصیلی نظر مناسب رہے گی، راجر بیکن نے فطرت کے استحصال کا تصور پیش کیا کیوں کہ وہ خود ایک وکیل تھا اور اس کو مجرمین سے حق اگلوانا ہوتا تھا لہذا اس کے نزدیک (Nature) سے حق (Truth) اگلوانے کے لیے بھی تعذیب فطرت (Torture of Nature) اور استحصال (Exploitation of Nature) ضروری قرار پایا، رینی دکارتے عقلیت پرستی کی وکالت کرنے والا ریاضی داں ہے، اس کی عقلیت پرستی کی ایک مثال ملاحظہ ہو، وہ کہتا ہے (I think, there for I am) یعنی "میرا سوچنا میرے وجود پر دال ہے"، دکارتے ہی سائنس میں نظریہ تقلیل یا تخفیف پرستی (Reductionism) کا بانی ہے (۱۱)، وہ عقل کو لامحدود اور کل کو جزو سے سمجھنے کا حامی ہے، وہ نظریہ تشکیک کا بھی علم بردار ہے جس کے مطابق ہر دلیل و نظریہ غیر یقینی ہے جب تک کہ وہ عقل کی بنیاد اور اس کے طریقہ کار (Method) کی خراد پر صحیح ثابت نہ ہوجائے، اس نظریہ تشکیک کے دور رس نتائج مرتب ہوئے اور خدا کے انکار کا احمقانہ خیال زور پکڑتا گیا، نیوٹن نے قدیم تصور کائنات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور یہاں سے فلسفہ کی اصطلاح میں ایک نئی گردان یا تعبیر گردان (New paradigm or paradigm shift) ہوتی ہے اور کائنات اور اس کی ہر شے ایک مشین قرار پائی ہے (۱۲)، جس سے خدا کی صفت "تدبر امر" کو زبردست جھٹکا لگتا ہے، ادھر لووائزر کے ذریعہ آکسیجن کی دریافت نے انسانی مشین کو ایک کیمیاوی مشین بنادیا تو مالتھس (Malthus) کے سوشیالوجی کے ماڈل پر مبنی ڈارون کے نظریہ ارتقا نے خدا بیزاری اور الحاد کی رہی سہی کسر بھی پوری

کردی، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں خدا کی جگہ خود سائنس نے لے لی، جس کا باقاعدہ اظہار David Landes اپنی کتاب میں کرتا ہے (۱۳) اور یہی صنعتی انقلاب کا کلائمیکس بھی تھا کیونکہ بیسویں صدی میں سائنسی نظریات میں وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن سے زمان و مکان کے پیمانے بدلے اور آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت اور کوانٹم میکینکس نیز کارل پاپر (۱۴)، ٹی ایس کہن (۱۵) اور فیرابند (۱۶) نے سائنس جدید کا حلیہ ہی بگاڑ دیا اور دوسری فلسفیانہ گردان کی بنیاد پڑی جس میں جدیدیت کے خلاف مابعد جدیدیت (Post-Modernism) کی تحریک نے زور پکڑ لیا۔

چونکہ ٹکنالوجی نظریاتی طور پر وقت کی سائنس اور معاشرہ کی امنگوں کی آئینہ دار ہوتی ہے، لہذا خدا بیزار معاشرہ اور دشمن فطرت سائنسی نظریات کے درمیان لذت و آرام اور روشن خیالی کے نام پر ایسے نظام ہائے معیشت و معاشرت اور اخلاق وجود میں آئے جن میں اباحیت پرستی (Permissivism)، افادیت پرستی (Utilitarianism)، سرمایہ داری (Capitalism) اور بے جا صارفیت (Consumerism)، اس معاشرہ کے اجزا لاینفک تھے (۱۷) اور مصنوعیت پسندی (Artificialism) اس کا طرۂ امتیاز، چوں کہ صنعتی دنیا میں مال کی کھپت اور اس کی مانگ نیز منافع اندوزی (Profit-motives) وغیرہ محرکات بنیادی رول ادا کرتے ہیں، لہذا پبلسٹی اور جھوٹے سچے اور نہ جانے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے جس سے بازار میں مصنوعات کی باڑھ آگئی اور خوش حالی و امارت کے پیمانے بدل گئے اور دوسرے میدانوں میں جدیدیت و مابعد جدیدیت کی کشمکش کے باوجود☆ فطرت کی سادگی اور خاموشی سے گھبراہٹ اور شور و شغب تصنع اور مصنوعیات سے رغبت بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو وقت کا کھانا بھی گھر کے بجائے ہوٹل میں اور روایتی کھانے کے بجائے فاسٹ فوڈ (Fast-food) خوش حالی اور راحت کا معیار بن گئے، کون سا میدان کار تھا جہاں ہم نے فطرت سے جنگ نہ کی، لہذا فطرت کو انتقام کے لیے بھی ایک نہ ایک دن میدان کارزار میں اترنا ہی تھا اور اسکا نتیجہ انسانوں کے لیے لازمی شکست ہی کی شکل میں آنا تھا، سو وہ کم از کم ماحولیاتی بحران کی شکل میں تو دنیا کے سامنے ہے۔

☆ درحقیقت یہ کشمکش کا عبوری دور ہے، اسی لیے بعض مفکرین اس کو نظریہ کے زوال کا عہد (Age of noideology) کہتے ہیں۔ (دیکھیے اسٹیفن مشل ۲۰۰۷)

اب ذرا اس تخفیف پسند یا تقلیلی (Reductionist) اور خدا بیزار سائنس کی کامیابی پر بھی ایک نظر تدبر ڈالیں جس پر مابعد جدیدیت (Post-Modernism) کی زوردار تنقید و تردید کا مزید انتظار ہے، کون نہیں جانتا کہ بیسویں صدی کے آغاز تک سائنس کی ہر قدر اور اس کے ہر کھرے کھوٹے فلسفیانہ نظریہ پر حقانیت کی مہر تصدیق اس کی نام نہاد تکنیکی ترقیات اور ان کی چکا چوند لگا دیتی تھیں، کس کی مجال تھی کہ مغربی سائنس پر زبان طعن دراز کرے، حقیقت تو یہ ہے کہ نہ صرف سائنس بلکہ مغرب کے سارے خدا بیزار نظریہ ہائے حیات کو اسی ناپائدار جھوٹی ترقی☆ نے انسانیت کا نجات دہندہ بنا کر پیش کیا اور ہمارے بعض مسلم بزرگوں تک نے مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کے نقش قدم پر چلنے کا مشورہ دیا، جب کہ معاملہ یہ تھا کہ مغربی سائنس دانوں کو گویا اندھے کے ہاتھوں "ترقی" نامی بٹیر آگئی تھی، یہ الگ مسئلہ ہے کہ وہ اندھا شکاری چند دنوں بعد خود اس طلسماتی بٹیر کے ہاتھوں شکار ہونے والا تھا، اب ذرا غور فرمائیے کہ اسی طرح کے چار اندھوں نے ماحولیاتی بحران کے ہاتھی کو اپنے اپنے تیز رو (fast-track) تجربات کی روشنی میں دنیا کو مختلف پہلوؤں سے سمجھانا شروع کر دیا ہے اور اس ہاتھی کے حصے بخرے کر کے شیطان نے سیدھے سچے سائنس دانوں کی آنکھوں پر فریب کے پردے ڈال دیے ہیں، حالاں کہ ہر عقل و ایمان والا اس کا جواب جانتا ہے مگر کتنے لوگ جرأت و جسارت رکھتے ہیں کہ یہ کہیں کہ عصری سائنس کی بنیاد کی ٹیڑھی اینٹ ہی کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور ایک نئی سائنس کی بنیاد ڈالی جائے جس میں اندھے کے ہاتھوں بٹیر آنے پر وہ بغلیں نہ بجائے اور ساون کے اندھے کی طرح اس کو سب ہرا ہی ہرا نظر نہ آئے (اخبار "دی ہندو" کی ۲۰ رجون ۲۰۰۸ء کی اشاعت کے ص ۱۸ پر ایک طرف سمندر کی سطح آب میں تیزی سے اضافہ پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے تو دوسری جانب بیماری کی پیشین گوئی اور تکنیکی ترقی پر خوشی کا اظہار بھی ہے، بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اتنا درست حساب ماضی میں ممکن نہیں تھا، گویا کینسر کے پھوڑے کی ضخامت ناپ کر بغلیں بجائی جا رہی ہیں "وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا اور کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا") نیز گزشتہ مثال کی طرح ایسے چار اندھے

☆ (حقیقی ترقی کیا ہے اس پر احقر کا تفصیلی مضمون بہ عنوان "حقیقی ترقی کے اسباب اور اسلام" شائع کردہ "برہان" دہلی کے اکتوبر-نومبر ۱۹۸۲ء کے شماروں میں ملاحظہ فرمائیں)۔

ہاتھی کو اپنے اپنے انداز میں چھاج، ستون، رسہ وغیرہ قرار نہ دینے لگیں بلکہ پہلے ان کو علم حقیقی کی بینائی سے آراستہ کیا جائے اور پھر ہاتھی کے افعال و اجزا (Components of Organs) کی بنیاد پر نام دینے کے بجائے ایک یکتا حیوان کل کی حیثیت سے سمجھا اور دیکھا جائے، ہمیں یقین کامل ہے کہ جب تک سائنس داں حقائق کی معرفت کے باب میں کلی نقطہ نظر (۱۸) (Holistic approach) اختیار نہیں کریں گے وہ سائنس بنیادی طور پر ناقص بلکہ کجی کا شکار ہی رہے گی اور ہم بلا خوف تردید عرض کرتے ہیں کہ مغربی سائنس داں حقائق فطرت کو ٹکڑوں میں بانٹ کر سمجھنے پر بارہا ٹھوکر کھا کر گرے ہیں اور ماحولیاتی بحران اسی ٹھوکر کا عظیم ترین مظہر ہے۔

عصری ماحولیاتی مسائل پر ایک علمی اور غیر جانب دارانہ جائزہ لینے کے بعد مناسب ہوگا کہ اس بحران کے سلسلہ میں یہ جائزہ لیا جائے کہ مختلف حلقوں سے اس مسئلہ کے اسباب اور ان کے تشفی بخش حل کے لیے کیا کیا آراء پیش کی جارہی ہیں، موٹے طور پر ان تمام آراء کو تین بڑی قسموں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

پہلا گروہ وہ ہے جو اس بحران کا حل ان ہی سائنس دانوں سے معلوم کرنا چاہتا ہے جو گویا اس میدان کے ماہر ہیں، یہ گروہ عوام، سیاست دانوں اور بیوروکریسی پر مشتمل ہے جو یا تو اتنی علمی لیاقت نہیں رکھتا کہ مسئلہ کا عالمانہ جائزہ لے کر اپنی کوئی رائے قائم کرسکے، یا ان کی تربیت اسی انداز پر کی گئی ہے کہ دوسروں کے دائرہ کار میں مداخلت صحیح رویہ نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ سائنس داں اس مسئلہ کا حل روایتی بجھکڑوں کی طرح دروازہ کو اونچا کرنے کے بجائے اونٹ کی ٹانگیں کاٹ کر اندر لے جانے کا مشورہ دے رہے ہیں یعنی اپنے بنیادی فلسفہ سائنس کے عین مطابق الگ الگ اجزا ہی میں اس کا حل پیش کر رہے ہیں (Piecemeal Solutions)، لہذا کہیں گلوبل وارمنگ کے حل کے لیے کاربن ڈائی آکسائڈ کو فضا سے چھان کر زمین میں دفن کردینے کی باتیں آرہی ہیں تو بعض لوگوں نے دبی زبان سے سمندر کی دیوہیکل سنک (Sink) میں مزید انجذاب کی رائے بھی دی جو نئے خطرات کے اندیشوں کے تحت ٹھکرادی گئی، ایک رائے یہ بھی آئی ہے کہ ایندھن کا کوئی ایسا متبادل تلاش کیا جائے جس سے کاربن ڈائی آکسائڈ فضا میں نہ بڑھے، بعض خوشامدیوں نے اپنے سیاسی لیڈروں کو خوش کرنے کے لیے اٹامک اور نیوکلیر انرجی کو بطور

ایندھن استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے تو کچھ لوگ بایو ٹکنالوجی کے ذریعہ حاصل شدہ ایندھن (Biofuel) یا مشینی ٹکنالوجی کی جگہ بایو ٹکنالوجی کو متبادل کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں (۱۹) اس قسم کے تمام حلوں (Solutions) کی مثال ایسی ہے جیسے کہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا، کیونکہ متبادل ٹکنالوجی کے لیے کون اس کی گارنٹی دے سکتا ہے کہ وہ بالکل نئے اور کہیں زیادہ مہیب مسائل کھڑے نہ کردے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کے جن کو بھی کسی بوتل میں بند کر کے مہر سلیمانی کہاں سے لائیں گے۔

ماحولیاتی بحران کے دوسرے بڑے مظہر یعنی اوزون ہول پر قابو پانے کے لیے کل کی بہترین اور آج کی بدترین سی ایف سی (CFCs) پر بندش (Ban) لگادی گئی اور اس کے بہتر متبادل کی تلاش جاری ہے اور اگر کوئی بہتر متبادل مل بھی جائے تو غریب ممالک اس کے پٹینٹ اور رائلٹی رائٹ (Patent & Royalti Rights) کے بوجھ تلے اتنے دب جائیں گے کہ کئی دہے سر نہ اٹھا سکیں گے،، کیونکہ سائنس و ٹکنالوجی کم از کم آج کل تو امیروں ہی کی میراث ہے۔

ماحولیاتی آلودگی سے نپٹنے کے لیے اس گروہ کے پاس خاصا پرکشش نسخہ ہے وہ یہ کہ ہم سے اصلاحی ٹکنالوجی (Treatment Technology) خرید کر لگاؤ چونکہ پالیسی ساز گروہ ان کے ساتھ ہے، لہذا بہت سے لوگوں نے جھوٹے سچے اعلانات کر کے عوام کو بہکایا ہے، فضائی آلودگی کو کم کرنے کے لیے موٹر گاڑیوں میں ایسی تبدیلی بھی کی گئی جس سے فضائی آلودگی کم سے کم ہو اور ایسے قانون بھی بنائے گئے جس سے فیکٹریوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں اور روزمرہ کے استعمال کی چیزوں میں آلودگی (Pollution) کی سطح گھٹے، یہ سارے حل اہون البلیتین (Lerser Evil) کے زمرہ میں داخل ہیں یا وقتی اور جزوی نوعیت کے حامل ہیں جنہیں سائنس داں، حکومت کے ارباب حل وعقد کو بتاتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے یہ سائنس داں کیوں کہیں کہ موٹر گاڑی سے پیر گاڑی پر آجاؤ اور فرج کا پانی چھوڑ کر سادہ پانی پینے لگو، جب کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ موجودہ سائنس مسائل کا وقتی اور جزوی حل نکالنے کی ہی اہلیت رکھتی ہے اور اجزا (Components & Parts) کی سطح پر ہی بہتر تبدیلی کی علم بردار ہے (۲۰)، مزید برآں جدید سائنس اچھے (Good) سے بہتر (Better) کی طرف پیش رفت کا نام ہے اور بہترین (Best) ایک ایسا آئیڈیل (Ideal) ہے جو

آج کے سائنس دانوں کے نزدیک اس عملی دنیا میں ممکن نہیں، اسی طرح ماحولیاتی بحران کا حقیقی پائدار اور مکمل حل (Perfect Solution) چاہے وہ زبان سے نہ کہیں، ان کے نزدیک ایک احمقانہ تخیل (Utopia) ہے۔

ماحولیاتی بحران سے نپٹنے کے لیے جو دوسرا گروہ میدان میں ہے وہ فطریات اور ماحولیات کے علم برداروں (Naturalists & Environmental Activists) کا ہے، ان کا اصل رول تو گویا یہ ہے کہ کہیں آگ لگ جائے یا چور آجائیں تو شور مچا دیں اور زیادہ سے زیادہ یہ کریں کہ جائے حادثہ پر جا کر دوسرے لوگوں کو بتائیں کہ مالکانِ مکان نے قیمتی فرنیچر رکھا ہے تو آگ بھی لگے گی اور چور بھی آئیں گے، اس طرح یہ گروہ تنقید میں تو خاصا آگے آگے ہے مگر مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں کوئی ٹھوس رائے نہیں رکھتا، اس گروہ کے اکثر علم بردار عصری سائنس اور سائنسی پالیسی سازوں پر اس پہلو سے تنقید کرتے ہیں کہ انہوں نے روایت اور تہذیبی ورثہ (Traditions) کو پامال کیا اور اس طرح یہ روایت پرست (Traditionalist cum Naturalist) لوگ ہیں، ان میں بعض لوگ تو اس حد تک روایت پسند اور فطرت پرست واقع ہوئے ہیں کہ زمانہ کے ساتھ دنیا میں کسی تبدیلی کے قائل نہیں، بعض لوگ جانوروں کے حقوق (Animal's right) کو انسانی حقوق (Human's right) پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کے نزدیک جانوروں کی جان گویا انسانی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے، بعض کے نزدیک جنگلات، آدی باسی، جنگلی جانور (Wild-animals) اور اسی قسم کے ماحولیاتی مسائل ہی اصل بحران ہے یا ان کو انہیں مسائل سے سروکار ہے باقی ماحولیاتی مسائل انہوں نے مغربی سائنس دانوں کے لیے چھوڑ دیے ہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس گروہ کی اکثریت مغربی سائنس کی بڑے زور وشور سے اور عالمانہ تنقید کرتی ہے (۲۱) مگر ان کے پاس کوئی ایسا جامع و آفاقی حل نہیں ہے جسے ماحولیاتی بحران کے پانچوں مظاہر کا تشفی بخش اور پائدار حل کہا جا سکے، کیونکہ اولاً تو اکیسویں صدی میں رہ کر گیارہویں صدی کی طرف پلٹنا ایک تصوراتی اور طلسماتی (Fictitiuns & Imaginary) واہمہ تو ہو سکتا ہے مگر عملی واقعہ گلوبل سطح پر تو ہرگز نہیں ہو سکتا، ثانیاً ان کے نزدیک ماحولیاتی مسائل کی کوئی آفاقی جہت ہو بھی تو اس کے حل کی کوئی آفاقی جہت نہیں ہے، ان کے خیال کے مطابق ہر علاقہ کا حل الگ ہوگا کیونکہ

روایتیں جگہ اور وقت کی پابند ہوتی ہیں۔

تیسرا گروہ اس ماحولیاتی بحران کے حل کی طرف پیش قدمی کرنے والا مذہب پسند گروہ ہے جو آفاقی اقدار کے ساتھ سائنس کے احیاء کا حامی ہے، اس گروہ کے علم برداروں میں ہندوازم، تاؤازم اور اسلام سرفہرست ہیں، ہم ہندوازم کے بارے میں صرف یہ عرض کریں گے کہ جہاں خدا کے وجود، عدم وجود اور توحید وجود ہی کے تعلق سے اگر اتفاق رائے نہ پایا جاتا ہو نیز فطرت و کائنات کے تعلق سے اور انسان کی اس دنیا میں حیثیت کے تعلق سے فلسفیانہ موشگافیاں پائی جاتی ہوں وہ ظاہر ہے سائنسی بحران کا کوئی آفاقی حل نہیں پیش کر سکتا اگر کسی گروہ کا یہ دعویٰ بھی ہو کہ وہ آیرویدا (Ayurveda) کے اصولوں کی بنیاد پر کوئی حل پیش کر رہا ہے تو وہ ہندوازم کا مستند حل نہیں مانا جا سکتا، کیونکہ جب بنیادیات ہی میں اختلاف رائے ہو تو پھر کسوٹی کیا ہوگی، تاؤازم بیشک ایک زمانہ میں چین کا زندہ مذہب تھا مگر کمیونسٹ انقلاب کے بعد وہاں کی غالب اکثریت ملحدانہ اور کمیونزم اقدار کی حامی ہوگئی اور اسی طرح دوسرے نظریات اور دوسری تہذیبوں کا حال ہے کہ یا تو وہ مغربی سائنس کے آگے ٹک نہیں سکے جیسے عیسائیت وغیرہ یا وہ دنیا میں اپنے نظریہ تک کو عددی پیمانوں پر نہ منوا سکے، ہمارے نزدیک اسلام اپنے عددی لحاظ سے بھی زندہ مذہب ہے، اس مذہب کی سائنسی ارتقا کے پہلو سے بھی ایک درخشاں تاریخ ہے اور بیسویں صدی کی احیائی تحریکیں بھی سائنسی احیاء میں مہمیز کا رول ادا کر رہی ہیں اور ان سب پر مستزاد یہ کہ چودہ سو سال بعد بھی دنیا کو اس مذہب میں وہ کشش نظر آتی ہے جو کسی آفاقی ہمہ گیر اور ہمہ جہت نظام حیات میں ہونی چاہیے، یہ بات کسی خوش فہمی پر مبنی نہیں ہے بلکہ اپنے اور غیر سبھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور مغرب نے تو گویا اپنی شکست خوردگی کا اعلان تک کر دیا ہے، ہمیں اس حقیقت کا برملا اظہار کر دینے میں کوئی جھجھک نہیں ہے کہ بیسویں صدی کے ماحولیاتی بحران نے خصوصاً مغرب اور مغربی سائنس کی پرفریب بالاتری کی قلعی کھول دی ہے، آج وہ اقدامی پوزیشن سے دفاعی پوزیشن میں آگئے ہیں اور اس مسئلہ میں بھی اسلامی سائنس ایک متبادل کی حیثیت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتی ہے، جس طرح اسلامی بینکنگ مشرق و مغرب میں اپنے پیر جمانے میں کوشاں ہے (۲۲)، مندرجہ ذیل سطور میں ماحولیاتی بحران اور اس کے حل کے تعلق اور خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اسلام کے مطابق یہ کائنات بے خدا نہیں ہے اور نہ اس کے بہت سے خالق ہیں، نیز اس کرۂ ارضی کو جو اس کائنات کا ایک ادنیٰ سا حصہ ہے، اس خلاق عالم نے جو پروردگار حقیقی بھی ہے انسان کی بود و باش کے لیے موزوں ترین بنایا ہے اور انسانی ضروریات کی ہر شئی میں میزان قائم کی اور اس کے لیے مسخر کیا، نیز انسان کو اس کرۂ ارضی میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اور یہ حکم دیا کہ نہ تو وہ یہاں کسی قسم کی سرکشی کرے، نہ فساد مچائے اور نہ توازن کو بگاڑے، مزید برآں خداوند قدوس نے انبیائے کرام کے ذریعہ خاص طور پر یہ ہدایت کی کہ طغیان (طَغیٰ)، بغاوت (بَغیٰ)، تَبذِیر، اِسرَاف، تَرَف، اِستِکبَار، تَکَاثُر اور فَسَاد اس کو بالکل پسند نہیں ہیں اور ان کے ذریعہ یہ پیغام بھی بھیجا کہ انسان کو اس دنیا میں بھیج کر اس کا امتحان لیا جا رہا ہے کہ وہ مختلف حقوق و فرائض کی بجا آوری کیسے کرتا ہے، علاوہ بریں کتاب کائنات کی علامتی نشانیوں کے ذریعہ، کتب الٰہی کی آیات کے ذریعہ اور پیغمبرانِ خدا کے اقوال کے ذریعہ اس کو بار بار یہ یاددہانی کرائی گئی کہ انسان پر اس کے رب کی شکرگزاری، عبادت اور فرماں برداری فرض ہے اور اس پر دوسرے انسانوں کے حقوق کی درجہ بدرجہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، نیز تمام جانداروں کے حقوق کی پاس داری بھی لازم آتی ہے، اس کے علاوہ کائنات کی تمام اشیا کے ساتھ اس کے رویہ کا بھی امتحان ہے اور خود اپنے نفس کے ساتھ اصلی خیرخواہی کی بھی ذمہ داری ہے اور قرآن حکیم کی روشنی میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رب العالمین کا قرآنی نام ہے، انسان کو عقل و شعور، ارادہ و اختیار اور مہلت عمر سے نواز کر موت کے دروازہ سے اپنے حضور جواب دہی کے لیے کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تاکہ اس کے اعمال کے مطابق سزا و جزا دے، اسلام میں "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار اللہ تعالیٰ کے سوا تمام حقیقی و موہوم ہستیوں، طاقتوں، خواہشوں اور نظریات کے انکار کا نام ہے، لہٰذا مغرب اور مغربی سائنس جن نظریات کے حامی ہیں، مثلاً استحالہ پرستی یا تخفیف پرستی (Reductionism)، اباحیت پرستی (Permissivism) اور افادیت پرستی (Utilitarianism)، عقلیت پرستی (Rationalism)، مادہ پرستی (Materialism) نظریہ تشکیک (Antoganism) وغیرہ، اسلام کا ان سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں، خاص طور سے جب یہ حد اعتدال سے باہر ہو جائیں اور ازم (ism) کے ساتھ استعمال ہونے لگیں۔

مندرجہ بالا امور کو اگر علمی سطح (Epistemological Plane) پر اور اصطلاحاً ادا کیا جائے

تو یوں کہنا مناسب ہوگا کہ اسلام، توحید فی الالوہیت، توحید فی الخلقت، توحید فی العبادت، توحید فی العلم، توازن فی الحقوق (عدل)، توافق فی الفطرۃ، احسان فی العمل، امانت فی الخلافت، عداوت من الشیطان اور کرامت للانسان کا داعی و علم بردار ہے اور زیر غور مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں اسلامی فلسفیانہ گردان (Islamic paradigms) کچھ اس طرح ہوں گے: توحید، تقویٰ، احسان، طہارت، امانت، خلافت، فطرت، عبادت، عدل و (توازن)، علم اور معاد (آخرت)۔ (باقی)

حواشی و مراجع

(۱) راجیو گرگ "Environment Quiz" دہلی پبلشنگ محل، طبع ثانی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۸۔ (۲) پی ہڈ (P.Hood) کتاب بہ عنوان (The Atmosphere) آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، لندن، ۱۹۵۲ء، مزید دیکھیے H.R.Singh کی کتاب بہ عنوان "Environmental Biology" مطبوعہ ایس - چاند اینڈ کمپنی لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۰۰۵ء۔ (۳) "Encyclopedia Americana" مطبوعہ ۱۹۹۱ء، ج ۹، ص ۵۸۸، Glorifier Incorporation,U.S.A، مزید دیکھیے "Encyclopedia of Environmental Pollution" (McGraw Hill, London, 8th edition, 1997)۔ (۴) عبدالرشید اگوان کتاب بہ عنوان "Islam and Environment" مطبوعہ "Institute of Objective Studies, 1997, New Delhi"، مزید دیکھیے "Environmental Pollution" مولفہ ٹمی کٹیال اور اسٹیک (Timmy Katyal & M. Stake) مطبوعہ ۱۹۹۸ء، انمول پبلی کیشن، نئی دہلی۔ (۵) اقوام متحدہ کی کانفرنس بہ عنوان "Environment & Development" منعقدہ ۱۹۹۲ء ڈاکومنٹ نمبر کانفرنس A/SI پارٹ ۳ و ۴۔ (۶) لاوزن ڈن (T. Lawson Dunn) کتاب بہ عنوان "Guide to Global Environmental Issues" مطبوعہ ۱۹۹۷ء، ص ۱۱ تا ۳۵ (U.S.A)۔ (۷) "Electronic Library http://elab.eserver.org/hfl0242.html"۔ (۸) "Anderson, Walter Truett (1995) The Truth About Thruth: De-confusing and Re-constructing the Postmodern World, New York: Penguin p.239-244 & p.111"۔ (۹) مسلم، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی بہ روایت حضرت ابوہریرۃ اور مسند احمد، نسائی، بیہقی فی الشعب بہ روایت حضرت جابر بن عبد اللہؓ۔ (۱۰) فرجاف کپرا "Fridjof Capra" کتاب بہ عنوان "The Turning Point" "Science, Society & Rising Culture" مطبوعہ Simon & Schuster, New York (1982)، مزید دیکھیے مریم جمیلہ کتاب بہ عنوان "Islam & Western Society" مطبوعہ Adam Publishers & Distributer, New Delhi تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء

(۱۱) Descartes Rene (1983) Principles of Philosophy Translated by V.R. Miller and R.P.Miller; Dorrdrecht:D. Reidel ۔ (۱۲) فرجاف کیپر "Fridjof Capra" کی کتاب بہ عنوان "The Turning Point : Science, Society & Rising Culture"، مطبوعہ نیویارک امریکہ ۱۹۸۲ء۔ (۱۳) ایضاً، نیز مریم جمیلہ "Islam versus the West"، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۱ء ملاحظہ ہو۔ (۱۴) کارل پاپر (Carl Popper) کتاب بہ عنوان "Logic of Scientific Discovery"، مطبوعہ ۱۹۸۰ء، Hutchinson ۔ (۱۵) تھامس کہن (Thomas S. Kuhn) کتاب بہ عنوان "Structure of Scientific Revolutions" مطبوعہ شکاگو یونی ورسٹی پریس ۱۹۷۰ء۔ (۱۶) فیرابینڈ (Fayaraband, Paul) کتاب بہ عنوان "Against Method; outline of an anarchistic theory of knowledge"، مطبوعہ لندن ورسو ۱۹۸۲ء۔ (۱۷) مریم جمیلہ کتاب بہ عنوان "Islam versus the West" ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، مطبوعہ ۱۹۸۱ء، نیز "Limits of Growth"، مولفین Dennis L. Meadowsetal مطبوعہ ۱۹۷۲ء۔ (۱۸) سید حسین نصر (S. Hussein Nasr)، "An Introduction to Islamic Cosmological Doctrines"، مطبوعہ Albany, New York (U.S.A), State University of New York Press(1993) ۔ (۱۹) ان تمام متبادل ٹیکنالوجیز کے سلسلہ میں ماحولیاتی میگزین "Down to Earth" ناشر CSE, New Delhi کے شمارے ۲۰۰۰ تا ۲۰۰۷ء۔ (۲۰) ضیاء الدین سردار کی کتاب "Arguments for Islamic Science" ناشر CSOS علی گڑھ اور کیپرا (F. Capra) کی کتاب "The Turning Point" پڑھیں۔ (۲۱) وندنا شیو (Vandana Shiva) کا مضمون بہ عنوان "جدید سائنس اور ماحولیاتی بحران"، مطبوعہ آیات علی گڑھ، ناشر CSOS علی گڑھ، شمارہ جنوری-اپریل ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۷ تا ۱۵۲، ان کی دوسری تحریریں بھی خاصی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، گرین پیس ایکٹیوسٹیس بھی خاصے سرگرم ہیں۔ (۲۲) شریعت پر مبنی (Shariah Complient Banking System) اسلامی بینکنگ مسلمانوں کے لیے خصوصاً اور غیر مسلمین کے لیے بھی تجربہ کے بہ طور متبادل بینکنگ "ہندوستان، پاکستان، ملیشیا، گلف، برطانیہ وغیرہ میں سنجیدگی سے لیا جارہا ہے، بعض یونی ورسٹیوں میں باقاعدہ اس کی تعلیم کی باتیں ہورہی ہیں، سوال نیت ومقاصد کا نہیں ہے بلکہ اس پرزور استدلال اور ان عوامل ومحرکات کا ہے جن کے نتیجہ میں باطل کم از کم برداشت کی سطح تک تو آیا، کیا اس میں بھی شک ہے اس معاملہ میں اخبار، تحریکیں، ادارے، دانش ور، علمائے اسلام بھی مثبت طریقہ سے کوشاں ہیں مگر سائنس کے معاملہ میں بحث کا آغاز کرنے والے ہی سرد مہری اور ذہنی انتشار کا شکار ہیں، الا ماشاء اللہ، غیر مسلم دانش ور تو اس شکر مغلوف مہلک سائنس و ٹیکنالوجی کے خلاف صف آرا ہیں مگر ہمارے دانش ور اس شکر کی خوبیاں گنا رہے ہیں، افسوس صد افسوس۔

قصۂ قارون کے بعض اہم پہلوؤں کی وضاحت

جناب حنیف نجمی

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر فرعون کے ذکر کے ساتھ قارون وہامان کا ذکر، عام فرعونیوں سے الگ، دو سرکردہ فرعونی لیڈروں کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور ان کی شقاوت اور بدبختانہ روش کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، سورۂ مومن کی آیات ۲۳-۲۴ سے صاف پتا چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے علاوہ، فرعونیوں کے ان دو سرغنوں کے پاس بھی بھیجا گیا تھا، آیات مذکورہ میں ارشاد ربانی ہے:

"ہم نے موسیٰ کو اپنے احکام اور کھلی ہوئی نشانی دے کر فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تو وہ لوگ بولے یہ جادوگر ہے، بڑا جھوٹا ہے"۔

قرآن کریم کے اس بیان سے فرعونی سلطنت میں قارون وہامان کے اثر ورسوخ اور فرعونیوں میں ان کی ممتاز ومنفرد پوزیشن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، دیکھا جائے تو یہ ایک قسم کی تثلیث شر وفساد ہے جو قدیم معاشرے کے تین شقی، متکبر اور مفسدہ پرداز انسانوں کے وجود ہائے نامسعود سے شکل پذیر ہوتی ہے، ان نفوس خبیثہ میں ایک بے حد وسیع وعریض سلطنت کا سربراہ تھا، دوسرا بے حد وحساب دولت کا مالک تو تیسرا وزارت ومصاحبت شاہی کے پروقار منصب پر فائز تھا، چاہیے تو یہ تھا کہ بہ تقاضائے عقل ودانش یہ لوگ ان بیش بہا انعامات خداوندی کے شکر وسپاس میں اطاعت کیشی اور غلامانہ نیازمندی کی راہ اختیار کرتے، مگر ان خاک زادوں کی بدبختی یہ تھی کہ یہ اپنی اصلیت کو فراموش کرکے تمرد وطغیان اور معصیت کیشی کی راہ چلے اور نتیجے کے طور پر ایک عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے، بالآخر ابدی عذاب ہی ان کے حصے میں آیا، اس ابدی عذاب و

نیل ولا، نیاپارہ، نگر وضلع دھمتری، چھتیس گڑھ، ۴۹۳۷۷۳۔

عقوبت کا سبب وہ علو واستکبار تھا جو تین مختلف راہوں - سلطنت، دولت، وزارت سے ان تینوں اشخاص کے اندر پیدا ہوا، یہ تینوں راستے انسان کو ابدی سعادت اور دائمی راحت و آسائش کی طرف بھی لے جانے والے ہیں بس شرط یہ ہے کہ آدمی کفرانِ نعمت سے اپنے دامن کو آلودہ نہ کرے، اگر یہ لوگ شکر وثنا کی ڈگر پر چلتے تو دارالمحن کے بجائے دارالسرور کے مستحق ہوتے مگر مشیئت ایزدی کو منظور ہی کچھ اور تھا۔

قرآن کریم میں لفظ قارون چار جگہ آیا ہے، دو بار سورۂ قصص (آیات ۷۶-۷۹) میں، ایک بار سورۂ عنکبوت (آیت ۱۳۹) میں اور ایک بار سورۂ مومن (آیت ۱۲۴) میں، سورۂ عنکبوت (آیت ۳۹) میں قارون، فرعون اور ہامان تینوں کی ہلاکت کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

قارون عربی زبان کا لفظ ہے، ایک گھاس کا نام ہے جسے فریز (بفتح وکسر اول) کہتے ہیں، انگریزی میں اسے (Galangle) اور لاطینی میں (Caraesus) کہتے ہیں، فریز ایک خوشبو دار گھاس ہے جو دوا بنانے کے کام آتی ہے۔

قارون: فریز کہ گیاہے است خوشبوے و درتداوی بکار می آید (منتہی الارب)۔

اسٹائنگاس کا اندراج یوں ہے:

"Farez, Firez, A fattening kind of grass; also a sweet-scented kind of grass".

قارون اپنے دور کا سب سے بڑا سرمایہ دار (Capitalist) تھا، اس کا تعلق مصر کی قدیم قوم قبطی (Coptie) سے نہ تھا، وہ اسرائیلی تھا اور حضرت موسیٰؑ کے خاندان بنی لاوی کا فرد تھا، تورات (گنتی باب ۱۶) میں جس قورح کا ذکر آیا ہے وہ یہی قارون ہے، یہودیوں کی کتاب "تلمود" میں بھی قورح کا ذکر آیا ہے، حضرت موسیٰؑ سے قارون کا کیا رشتہ تھا، اس باب میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن تورات کی کتاب "خروج" (آیات ۱۸ تا ۲۱) میں جو نسب نامہ درج ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کا چچازاد بھائی تھا، اس نسب نامے سے پتا چلتا ہے کہ قہات کے چار بیٹے تھے: عمرام، اضہار، حبرون اور عزئیل، حضرت موسیٰؑ کے والد عمرام تھے اور قارون کا باپ اضہار تھا، قارون کے دو بھائی اور تھے جن کے نام نفج (Nepheg) اور زکری (Zichri) تھے،

تورات کے بیان کی تصدیق تفاسیر قرطبی وروح المعانی میں منقول حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، ان تفاسیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قارون تورات کا بہترین حافظ اور عالم تھا، حضرت موسیٰ نے جن ستر اصحاب کو میقات کے لیے منتخب کیا تھا، ان میں قارون بھی شامل تھا، علم دین کی غیر معمولی سعادت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود قارون دین حق سے منحرف ہوگیا اور سامری کی طرح منافقت کی راہ چل کر ابدی شقاوت کے گڑھے میں جاگرا، تفسیر قرطبی میں (بہ روایت یحیٰ بن سلامؒ وسعید ابن میسیبؒ) یہ بھی مرقوم ہے کہ فرعون نے قارون کو بنی اسرائیل پر عامل مقرر کر دیا تھا اور وہ اس حیثیت سے ان پر ظلم ڈھاتا تھا اور ان کا استخفاف کرتا تھا، بعض مفسرین نے فَبَغٰی عَلَیْھِمْ سے قارون کا یہی ظلم واستبداد مراد لیا ہے۔

قارون بے حد وحساب دولت کا مالک تھا، اس کا اشارہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"بے شک قارون موسیٰ کی برادری سے تھا، پھر اس نے ان کے خلاف سر اٹھایا اور ہم نے اسے اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت پر بھی بھاری پڑتی تھیں"۔ (قصص ۷۶)

دائرۂ معارف یہودیہ میں قارون کی سرمایہ داری کے بیان کے ذیل میں نہ صرف یہ صراحت موجود ہے کہ اس کے خزانوں کی کنجیوں کے لیے تین سو خچر درکار ہوتے تھے بلکہ منجملہ دیگر اسباب کے اس کے کثیر المال ہونے کا ایک سبب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قارون کو حضرت یوسفؑ کے ان خزانوں میں سے ایک خزانہ مل گیا تھا جو انہوں نے مصر میں چھپا دیے تھے۔

"Korah is represented as the possesser of extraordinary wealth he having discovered one of the treasures which Joseph had hidden in Egypt. The keys of Korah's treasurs alone formed a load for three hundred mules". (Jewish Encyclopaedia Vol. VII P.556)

جیوش انسائیکلوپیڈیا کے اس بیان کی تصدیق روح المعانی میں منقول ایک روایت سے

بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت عطاؒ ہیں اور جس میں صریح الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا ایک زبردست خزانہ قارون کے ہاتھ لگ گیا تھا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قارون کیمیا گری سے واقف تھا اور دھاتوں کی ماہیت تبدیل کر کے ان کو سونا بنالیتا تھا، اس طرح اس نے دولت کے انبار جمع کر لیے تھے لیکن امام ابن کثیرؒ نے اس بات کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ علم ہی نرا فریب ہے، کسی چیز کی ماہیت کو تبدیل کر دینا آدمی کی قدرت سے باہر ہے، جو لوگ قارون کے واقف علم کیمیا ہونے کے قائل ہیں ان کا خیال ہے کہ قوم کے ارباب علم و دانش کی وعظ و تلقین کے جواب میں قارون متکبرانہ انداز میں جب یہ کہتا ہے کہ ”مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بہ دولت ملا ہے“ تو علم سے اس کی مراد علم کیمیا ہی ہوتی ہے لیکن ایک اور اہم نکتہ اس قصے میں سر اٹھاتا ہے۔

قارون کے مال و متاع کی حد درجہ فراوانی نیز اس کے خزانوں کی کنجیوں کے بیان پر ممکن ہے بعض لوگ متعجب ہوں، یہ ایک فطری بات ہے لیکن اس دور کے حالات کو نظر میں رکھا جائے تو ایسا ہونا مستبعد معلوم نہیں ہوتا، پھر غلط بیانی اور افسانہ طرازی کتاب اللہ کی شان سے قطعاً بعید ہے، وہ زمانہ بینکوں، لاکروں اور تجوریوں کا تو تھا نہیں اور نہ آج کی طرح کے قفل و کلید اس زمانے میں میسر تھے، سرمایہ دار اور دولت مند اشخاص کے لیے اپنے خزانوں کو سینت سنبھال کر رکھنا ایک بڑا مسئلہ تھا، اس مقصد کے لیے وہ لوگ عموماً زمین دوز (Underground) خزانے بنواتے تھے، ان خزانوں میں بڑے بڑے بھاری بھرکم آہنی دروازے لگا کر ان میں لوہے کے بھاری بھرکم اڑنگوں کا استعمال کیا جاتا تھا، ایسی صورت میں خیال کیجیے کہ ان خزانوں کو محفوظ کرنے کی چیزیں تعداد میں کتنی کثیر اور وزن میں کتنی بھاری ہوتی ہوں گی، پھر ان کے بست و کشاد اور نقل و حمل میں اگر آدمیوں کی ایک طاقت ور جماعت بھی گراں بار ہو جاتی تھی تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، دور جدید کے ممتاز مفسر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی انگریزی تفسیر میں ایک اور ہی انداز سے اس نکتے کی وضاحت کی ہے، فرماتے ہیں:

"A great banker and financier as he was, he must have employed a large staff of cashiers, accountants,

ledger keepers and peons". (Vol III. Qasas:76)

(قارون چونکہ ایک بڑا سرمایہ دار اور ساہوکار تھا، اس لیے اس نے لامحالہ ایک زبردست اسٹاف خزانچیوں، محاسبوں، سیاہہ نویسوں اور چپراسیوں کا لگا رکھا ہوگا)

کلید برداروں کا ایک بڑا عملہ جو اس کام کے لیے مستقل طور پر رکھا گیا تھا، یعنی ایک بڑی جماعت تھی جو اس کے خزانوں کی کنجیاں سنبھالتی تھی، ان کنجیوں کو اٹھانا دھرنا اس جماعت کے لیے بڑا کٹھن اور پشت شکن کام تھا، قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ قارون حضرت موسیٰ کی برادری سے تھا (اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى - قصص ۷۶) لیکن وہ اپنی برادری سے کٹ کر فرعون سے جاملا تھا، اس مقام پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قارون نے یہ روش کیوں اختیار کی، اس اقدام کے پس پشت کون سا مقصد کارفرما تھا؟

قارون دراصل اپنی بے اندازہ دولت کے نشے میں چور تھا، اس لیے وہ حضرت موسیٰ اور دیگر اسرائیلیوں کو خود سے حقیر و کم تر سمجھتا تھا، وہ اس زعم باطل میں مبتلا تھا کہ چونکہ میرے پاس بے حد حساب مال و متاع ہے، اس لیے ہر قسم کی توقیر و شان اور ہر طرح کے جاہ و حشم کا حق دار میں ہی ہوں، اپنی مفروضہ تقدیس و عظمت کے اسی خبط کی وجہ سے وہ تمام اسرائیلیوں کا استخفاف کرتا تھا، حتی کہ پیغمبران برحق (حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارون) کی تضحیک کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو قوم کی امامت و قیادت کے تعلق سے جو قدر و منزلت عطا کی تھی، اس نے قارون کو سخت حسد میں مبتلا کر دیا تھا، دراصل وہ اس معاملے میں یَمُوْتُ مِنَ الْحَسَدِ کے مقام پر پہنچ گیا تھا، اس لیے اس نے نہ صرف پیغمبر خدا کی امامت و سیادت سے انکار کیا بلکہ بنی اسرائیل کے ڈھائی سو ممتاز و منفرد اشخاص کو ساتھ لے کر حضرت موسیٰ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، بہت سے ارباب غرض بھی اس کے ہم نوا ہو گئے، قارون کی منطق یہ تھی کہ جب ہماری جماعت کا ہر آدمی یکساں طور پر مقدس و محترم اور خدا پرست ہے تو پھر موسیٰ ہی کو امامت و قیادت کا دعوا کیوں ہے، تورات (باب ۱۶، ۱-۳) میں صریح الفاظ میں درج ہے۔

"Now Korah, the son of Izhar, the son of Kohath, the son of levi, and Da'than and A-biram. the sons of Eliab

and on the son of Pe'leth, the sons of Reuben, took men. And they rose before Moses, with certain of the children of Iszael, two hundread and fifty princes of the assembly, famous in the congregation, men of renown. And they gathred themselves together against Moses and against Aaron, and said unto them, ye take too much upon you, seeing all the congregation are holy, everyone of them, and the Lord is among them. Where fore then lift ye up your selves above the congregation".

(Authorised King James Version)

اور قورح بن اضہار بن قہات بن لاوی نے بنی روبن میں سے الیاب کے بیٹوں داتن اور ابیرام اور پلت کے بیٹے اون کے ساتھ مل کر اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور بنی اسرائیل میں سے ڈھائی سو اور اشخاص جو جماعت کے سردار اور چیدہ اور مشہور آدمی تھے، موسیٰ کے مقابلے میں اٹھے اور وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہو کر ان سے کہنے لگے، تمہارے تو بڑے دعوے ہو چلے، کیونکہ جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خداوند ان کے بیچ رہتا ہے سو تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیوں کر ٹھہراتے ہو)

مال و دولت کی فراوانی نے قارون کو زبردست مادیت پرست بنا دیا تھا، وہ پکا دنیا پرست تھا، ایسا دنیا پرست جو احسن تقویم کے اعلا وارفع مقام سے گر کر سگ دنیا کی اسفل ترین سطح پر آ گیا تھا، اب اس کے پیش نظر چند مقاصد خبیثہ تھے جن کی وہ بہر صورت تکمیل کرنا چاہتا تھا، اگر وہ حضرت موسیٰ کے پیغام حق کو قبول کر لیتا تو اس کے وہ مقاصد پورے نہ ہوتے، وہ خود کو قانون الٰہی کی پابندی سے بالکل آزاد رکھنا چاہتا تھا اور اپنے مال و متاع نیز اپنے مادیت پرستانہ مفاد کا تحفظ کرنا چاہتا تھا، اس مقصد کے لیے اس نے پہلے تو اپنے خاندان کی مذہبی پیشوائی حاصل کرنا چاہی لیکن جب وہ ایسا کرنے میں ناکام ہو گیا تو اس نے فرعونی دربار میں پناہ لی، قارون خود کو ان

حقوق واجبہ سے بالکل مبرا رکھنا چاہتا تھا جو خدا اور بندگان خدا کے تعلق سے اس کے مال و دولت پر عائد ہوتے تھے، وہ بہ صورت زکوٰۃ و انفاق فی سبیل اللہ اپنے مال کے کسی حصے سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا، وہ مال و دولت کے انباروں پر پھن کاڑھے ہوئے سانپ کی طرح بیٹھا رہنا چاہتا تھا اور یہی اس نے کیا بھی، دائرۂ معارف یہودیہ میں صاف لفظوں میں درج ہے کہ قارون نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا کہ شریعت موسوی کی پابندی کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

"Korah incited all the people against Moses, arguing that it was quite impossible to endure the laws instituted by the latter". (Jewish Encyclopaedia Vol. VII, P.557)

قرآن کریم میں مذکور ہے کہ قارون کا غرور و استکبار دیکھ کر اس کی قوم کے اصحاب علم و دانش نے نہایت حکیمانہ انداز میں اسے یہ نصیحت کی کہ اپنے مال و دولت پر گھمنڈ مت کرو، یہ مال و متاع سراسر اللہ کی بخشش اور اس کا فضل و کرم ہے، جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی بندگان خدا پر احسان کرو، بخل کا رویہ چھوڑ دو، اصحاب دانش کی تلقین کے جواب میں قارون نے نہایت متکبرانہ انداز میں کہا "مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم سے ملا ہے، خدا کے فضل و کرم کا اس سے کیا تعلق؟" قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے۔

"جب، کہ اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا اتراؤ مت اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو اور دنیا میں سے اپنے حصہ کو نہ بھولو اور جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو اور زمین پر فساد کے طالب مت بنو، اللہ تعالیٰ فساد چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اس نے جواب دیا مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بہ دولت ملا ہے"۔ (قصص ۷۶-۷۸)

"قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ" سے قارون کی اصل نفسیات اجاگر ہوتی ہے جو علو استکبار میں مبتلا ہر دور کے مترفین کی نفسیات ہے، قارون کو یہ زعم تھا کہ یہ مال و دولت

میری قابلیت، میری استعداد اور میرے استحقاق کا ثمرہ ہے، کسب معاش، تجارت اور حصول مال و زر میں جو کمال مجھے حاصل ہے، یہ دولت اسی کا ماحصل ہے، میری حسن تدبیر اور اقتصادیات میں میری مہارت کا کرشمہ ہے، پھر میں اس پر خدا اور اس کے بندوں کا کوئی حق کیوں تسلیم کروں اور خواہ مخواہ اپنی دولت کے ایک حصے سے دست بردار ہو جاؤں، قارون خدا کی ذات کے بجائے اپنے تمول و تونگری کا سرچشمہ، اپنی ذات، اپنے علم و فن کو سمجھتا تھا، یہ سراسر کافرانہ سوچ ہے، شرمناک کفرانِ نعمت ہے اور کفر کی ان صورتوں میں سے ایک صورت ہے جس کی طرف قرآن کریم میں متعدد مقامات میں اشارہ کیا گیا ہے، قارونی سوچ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو مال و دولت سے نوازتا ہے تو وہ اللہ کا شکر گزار ہونے کے بجائے یہ کہتا ہے کہ یہ تو میرا استحقاق ہے، خدا نے یہ نعمتیں مجھ پر اس لیے ارزانی فرمائی ہیں، کیوں کہ وہ اپنے علم سے یہ بات جانتا ہے کہ میں ان انعامات کا مستحق ہوں، سورۂ حم السجدہ (آیت ۵۰) میں آدمی کے اس رویے کی جانب واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے:

"بھلائی مانگنے سے انسان تھکتا نہیں اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے اور جو مصیبت اسے پہنچ چکی ہے، اس کے بعد اگر ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھائیں تو کہہ اٹھتا ہے کہ اس کا تو میں حق دار ہی تھا"۔

یعنی آدمی اللہ کا شکر گزار ہونے کے بجائے گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنی مرفہ الحالی کو اپنی تدبیر اور حکمت و دانائی کا کرشمہ تصور کرتا ہے بلکہ قارونیت کی راہ میں دو چار قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہنے لگتا ہے کہ میں خدا کا مقبول بندہ ہوں اور اپنی دولت و حشمت کو بہ طور دلیل پیش کرنے لگتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ میں تو ہمیشہ سے اس عزت و شرف کا حق دار تھا اور رہوں گا، مجھ سے یہ میری توقیر و شان کون چھین سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی پیہم دعوت و تلقین نیز قوم کے ارباب علم کی مسلسل فہمائشوں کے باوجود قارون جب تمرد و طغیان کے راستے پر برابر بڑھتا ہی چلا گیا تو بالآخر خدا کا عذاب حرکت میں آگیا اور ایک دن اسے اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا، ارشاد ربانی ہے:

"آخر کار ہم نے اسے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا"۔ (قصص ۸۱)

بخاری شریف (کتاب اللباس) میں رسول کریم کی ایک حدیث درج ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"ایک آدمی اپنی ازار زمین پر لٹکائے جا رہا تھا، اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ تکبر پسند نہیں آیا اور اسے زمین میں دھنسا دیا گیا، پس وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا"۔

قارون کے خزانے کو "گنجِ رواں" اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ یہ زمین کے نیچے اب بھی رواں ہے۔

قارون کو خدا کے عذاب نے کیوں کر پکڑا اور اس کا مال و متاع کیسے تباہ و برباد ہوا، قرآن کریم نے اس کی تفصیل نہیں بیان کی، تورات نے البتہ اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے، جب حضرت موسیٰ نے دیکھ لیا کہ قارون اپنی متکبرانہ روش سے باز نہیں آنے والا تو انہوں نے اس کو مباہلہ کی دعوت دی، تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے، قارون کے اس دعوے کی قلعی کھل جائے کہ میں خدا کا مقبول بندہ ہوں تبھی تو اس نے مجھے بے حد و حساب دولت سے نوازا ہے، پھر میں موسیٰ کی بات کیوں مانوں اور اس کی اتباع کیوں کروں۔

چنانچہ حضرت موسیٰ نے اس پر لعنت اور بد دعا کی اور قارون اپنے قصر و خزائن سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا، تورات کی حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

"And Da'than and A-biram come out and stood in the door of their tents, and their wives and their sons, and little children. And Moses said, Hereby ye shall know that the Lord hath sent me to do all these works; for I have not done them of my own mind. If these men die the common death of all men, or if they be visited after the visitation of all men; then the

Lord Hath not sent me. But if the lord mak a new thing, and the earth open her mouth and swallow them up, with all that appertain unto them, and they go down quik into the pit, then ye shall understand that these men have provoked the lord".

(Numbers Chap.16, 27-31)

(اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں، بیٹوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازے پر کھڑے ہوئے، تب موسیٰ نے کہا، اس سے تم جان لو کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ میں یہ سب کام کروں، کیوں کہ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا، اگر یہ آدمی (یعنی قارون اور اس کی پارٹی) ویسی ہی موت مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثات گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں، پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے)۔ (گنتی باب ۱۶، آیات ۲۷-۳۱)

آگے کی آیات میں بتایا گیا ہے کہ جیسے ہی حضرت موسیٰ نے اپنی گفتگو ختم کی، قارون کو خدا کے عذاب نے آلیا۔

"And it came to pass, as he had made an end of speaking all these words, that the ground clove asunder that was under them. and the earth opened her mouth and swallowed them up, and their houses, and all the men that appertained unto Korah, and all their goods. they and all that appertained to them went down alive into the pit and the earth closed upon them; and they perished from among the

congregation. And all Israel that were round about them fled at the cry of them; for they said, lest the earth swallow us up also". (Numbers Chap.16, 31-34)

(اس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین ان کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور ان کو اور ان کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور ان کے سارے مال و اسباب کو نگل گئی، سو وہ اور ان کے سارا گھر بار پاتال میں سما گئے اور زمین ان کے اوپر برابر ہو گئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے اور سب اسرائیلی جو ان کے آس پاس تھے ان کا چلانا سن کر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ زمین کہیں ہم کو بھی نہ نگل لے) (گنتی باب ۱۶، آیات ۳۱-۳۴)

خدا کا عذاب جب کسی کو پکڑتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے اس کا کچھ اندازہ قارون کے عبرت ناک انجام سے ہو جاتا ہے، دائرۂ معارف یہودیہ نے اس کا بڑا دردناک منظر پیش کیا ہے:

"At the time of Korah's engulfment, the earth became like a funnel, and every thing that belonged to him, even linen that was at the launderer's and needles that had been barrowed by persons living at a distance from Korah, rolled till it fell into the Chasm. According to the Rabbis, Korah himself underwent the double punishment of being burned and buried alive". (Vol.VII. P.557)

(قارون کو جب عذاب الٰہی نے گھیرا تو زمین کی شکل قیف کی طرح ہو گئی، اس وقت قارون کی ہر چیز حتی کہ وہ کپڑے جو دھوبی کے یہاں تھے اور وہ سوئیاں جو قارون کے گھر سے بہت دور رہنے والے لوگ مستعار لے گئے تھے وہ سب کے سب لڑھکتے اس گڑھے میں آگرے، ربیوں کے خیال کے مطابق قارون دہری سزا سے دوچار ہوا، وہ آگ میں جلا بھی اور زندہ دفن

بھی ہوا) (جلد ہفتم، ص ۵۵۷)۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو حقیر و کم تر اور خود کو بڑا معزز اور فائق و برتر ثابت کرنے کے لیے قارون نے ایک جلوس بھی نکالا تھا، تاکہ وہ اپنی دولت و حشمت اور اپنے کر و فر کا مظاہرہ کر سکے، اس جلوس کو ہم جدید سیاسی زبان میں ریلی (Rally) کہہ سکتے ہیں، اس ریلی کا مقصد عوام کو مرعوب کرنا تھا، چنانچہ جو لوگ دنیا کے عارضی مال و متاع پر فریفتہ ہونے والے تھے وہ قارون کے شان و شکوہ کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے اور کہنے لگے کہ قارون واقعی بڑا خوش قسمت ہے، کاش ہم کو بھی اس کے جیسی دولت و حشمت مل جائے، مگر جو لوگ سچی ایمانی بصیرت سے بہرہ ور تھے، وہ قارون کے طمطراق سے ذرا بھی مرعوب و متاثر نہ ہوئے، انہوں نے کہا، یہ مال و دولت عارضی اور فانی ہے، اصل انعامات تو وہ ابدی نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ آخرت میں اپنے بندگان صالح کو عطا فرمائے گا، قرآن مجید بتاتا ہے کہ جو لوگ قارون کے کر و فر پر مٹنے والے تھے اور قارونی جاہ و حشم کے خواہش مند تھے، انہوں نے جب قارون کا یہ عبرت ناک حشر دیکھا تو اپنی سوئے فکر اور خام خیالی پر نادم ہوئے اور کہنے لگے کہ اللہ کا ہم پر بڑا فضل و احسان ہوا کہ ہم قارون کے ہم نواؤں میں شامل نہ ہوئے ورنہ ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو قارون اور اس کے ساتھیوں کا ہوا۔

یہ تھا قصہ اس قارون کا جو حضرت مسیح سے ہزاروں سال قبل مصر کے قدیم معاشرے میں قبطیوں کے درمیان بود و باش رکھتا تھا، جو فرعونیت سے وفاداری اور موسیٰ و رب موسیٰ سے بے وفائی کی پاداش میں کیفر کردار تک پہنچا لیکن دیکھا جائے تو آج کے ترقی یافتہ جدید معاشرے میں بھی قارونیت کے نمونے ناپید نہیں ہیں، آج بھی ایسے بے شمار قارون صفت انسانوں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جو اپنے بخل اور مادیت پرستانہ رویے سے قارون کی یاد دلاتے رہتے ہیں، یہ قارونی نمایندے خود کو حد درجہ ذی شعور اور روشن دماغ ظاہر کرتے ہیں اور احکام شرعیہ کی مخلصانہ اتباع کرنے والے بندگان خدا کو سفیہ اور احمق سمجھتے ہیں، ان جدید قارونوں کی گفتار سے، کردار سے، حتی کہ ایک ایک جنبش چشم و ابرو سے قارونی نفسیات کا اظہار ہوتا ہے، یہ درہم و دینار کے بندے مال و زر کے انباروں پر پھن کاڑھے ہوئے سانپ کی طرح بیٹھے رہنے میں بڑا سکون محسوس

کرتے ہیں، متاع دنیا پر مفتون و فریفتہ ہونے والے یہ روشن خیال لوگ خود کو خدا کے قانون سے بچانے نیز اپنے مادیت پرستانہ مفاد کے تحفظ کے لیے ہر اس نظریہ، ہر اس نظام فکر، ہر اس مسلک، ہر اس مدرسۂ فکر کا سہارا لیتے ہیں جو ناجائز طریقوں سے کمائی ہوئی ان کی دولت کو تحفظ فراہم کر سکے اور ان کی سرمایہ داری پر آنچ نہ آنے دے، ساتھ ہی ساتھ کسب و حصول مال و زر کے میدان میں انہیں کھل کھیلنے کا موقع دے اور ان کے غلط اور ناجائز اقدامات کے لیے جواز فراہم کر سکے۔

کیا ہرج ہے اگر شائقین شعر و ادب کی ذہنی ضیافت کے لیے قارون اور اس سے متعلق اشیا کے حوالے سے چند اشعار پیش کر دیے جائیں، فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شعرا نے اس تلمیح کو بروئے کار لاکر بہت عمدہ مضمون آفرینی کی ہے، ایسے اشعار کی تعداد تو سیکڑوں ہے لیکن اردو میں آتش کا اور فارسی میں حافظ کا شعر بہت مشہور ہے، آتش نے اپنے شعر میں صفت حسن تعلیل کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

چو گل گر خردۂ داری خدارا صرف عشرت کن
کہ قاروں را غلطہا داد سودائے زر اندوزی
(حافظ شیرازی)

(اگر تو پھول کی طرح زیرہ رکھتا ہے تو خدا کے لیے عیش و عشرت میں خرچ کر، اس لیے کہ زر اندوزی کے جنون نے قارون کو بڑا نقصان پہنچایا)

گڑ گئے گلبن چمن میں رشک سے تیرے حضور
اب زر گل صاف قاروں کا خزانہ ہوگیا
(ناسخ لکھنوی)

عدم کی راہ میں اک گنج ڈالتے اے بحر
ہمارے پاس نہ قارون کا خزانہ ہوا
(بحر لکھنوی)

قاروں کے دل پہ خنجر خوف اجل لگا
گاو زمیں کی شاخ میں سوبار پھل لگا
(میرانیس)

تم کو بخشا ہے خدا نے جو حیا کا زیور
مول اس کا نہیں قاروں کا خزانہ ہرگز
(چکبست لکھنوی)

اگر قیاس کنم پیش ہمت عالیش
چہ گنج خانہ قاروں چہ نیم پر ذباب
(امیر معزی)

(اگر میں اس کی ہمت عالی کے پیش نظر غور کروں تو مجھ کو قارون کا گنج خانہ اور مکھی کا نیم پر دونوں برابر لگتے ہیں)

حضرت شیخ سعدی کا حسب ذیل شعر بھی اہل علم کے حافظے میں تقریباً حلول کر چکا ہے۔

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت
نو شیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

یہ بخل وہ ہے کہ جس کے سبب سے اے منعم
زمیں کے تحت میں قارون کا خزانہ ہوا
(صبا لکھنوی)

وہ پیاسا ہوں کہ پانی مجھ سے فوارے چھپاتے ہیں
خزانہ حوض کا گنجینہ بن جاتا ہے قاروں کا
(اسیر لکھنوی)

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
(اقبال)

عراق

(۳)

کلیم صفات اصلاحی

عراق پر اشکانیوں (۱) کا تسلط: سطور بالا میں گذر چکا ہے کہ قدیم ایران کی ہخامنشی سلطنت کا خاتمہ جس کا دائرہ اقتدار سرزمین عراق تک پھیلا ہوا تھا، سکندر اعظم کے ہاتھوں ہوا، اس عظیم الشان سلطنت کے خاتمہ کے بعد یونانیوں کے سیاسی اور تہذیبی غلبے اور دبدبے کا دور شروع ہوتا ہے، یونانیوں نے ایران کو سیاسی کے ساتھ ساتھ فکری اور تہذیبی اعتبار سے بھی متاثر کیا اور ایران یونان کے منت گزاروں میں داخل ہوگیا لیکن بابل میں سکندر کی موت کے بعد اس کے وسیع ایشیائی مقبوضات پر جانشینی کے مسئلہ نے جو صورت اختیار کی وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، اقتدار کی ہوس نے خود یونانیوں کے درمیان باہمی جنگ وجدل اور باہمی عداوت ومخاصمت کو جنم دیا جس کے نتیجہ میں ہر طرف طوائف الملو کی صورت پیدا ہوگئی، علامہ طبری لکھتے ہیں:

فاختلف اهل العلم باخبار الماضيين فى الملك الذى كان بسواد العراق بعد الاسكندر وفى عدد ملوك الطوائف الذين كانوا ملكوا اقليم بابل بعده ۔ (۲)

سکندر کے بعد سواد عراق کی حکومت اور اس کے بعد بابل کے حکمرانوں کی تعداد کے سلسلہ میں مورخین مختلف الخیال ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ سکندر نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں یونانیوں اور اپنی محکوم قوموں کے درمیان میل ملاپ اور ایک دوسرے سے گھل مل کر رہنے کی تاکید اور شعوری کوشش کی تھی، اس سے اس کا مقصد غالباً عالمی سلطنت اور تہذیب کی بنیاد رکھنا تھا، اس کے بعد گرچہ اس کے بعض جانشینوں

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

نے اس کے اس انداز حکومت اور حکمت عملی کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کی اس روایت کو باقی و زندہ رکھنا چاہا، تاہم باہمی کشمکش اور اقتدار کی لڑائی کے باعث وہ اس سیاسی بصیرت کے تقاضوں سے عہدہ برآنہ ہوسکے اور اشکانیوں کے لیے یہ موقع فراہم کردیا کہ وہ یونانیوں کو بابل سے بے دخل کردیں، چنانچہ ۲۴۷ ق م میں اشکان اول نے یونانی حکومت کے خلاف بغاوت کرکے جو ریاست شمال مشرقی ایران کے صوبہ پارتھیا میں قائم کی وہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے جانشینوں کے زمانے میں مغرب میں پھیلتی رہی، یہاں تک کہ اس نے ایران اور عراق سے یونانیوں کو نکال باہر کیا۔(۳)

اشکانی خانوادے کی سلطنت کا مؤسس اول تو ارشک اول ہے جس نے سلوکیدیوں یعنی یونانی فوجوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی تھی، تاہم مہرداد اول نے جس کا عہد سلطنت مورخین کی تحقیق کے مطابق ۱۷۴ سے ۱۳۶ ق م تک ہے، آذربائیجان کو فتح کیا اور اسی عہد میں یونانی علاقوں میں رومی فوجیں بھی داخل ہورہی تھیں اور رومی یونانی معرکہ آرائی میں رومی فاتح ہورہے تھے، جس کے سبب سلوکیدی کمزور ہوگئے تھے، مہرداد نے اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور اپنی فتوحات کا سلسلہ عیلام فارس اور بابل تک بڑھالیا اور سلوکیدی بادشاہ دمتریوس دوم کو ۱۴۰ ق م میں شکست دی (۴)، اشکانی حکومت کے حدود کے سلسلہ میں مورخین نے لکھا ہے کہ شمال میں دریائے سیحون، بحیرۂ خزر اور کوہ ہائے قفقاز کے پشت کی سرزمین، جنوب میں خلیج فارس، بحیرۂ عمان اور بحر اوقیانوس و ہند، مشرق میں کوہ ہائے ہمالیہ، پنجاب و سندھ اور مغرب میں دریائے فرات (۵)، اتنا ہی نہیں بلکہ اشکانی عہد سلطنت کے بعض فرماں رواؤں نے اپنے پایہ تخت دریائے دجلہ کے بائیں ساحل پر شہر سلوکیہ کے آمنے سامنے شہر تیسفون☆ کو بنایا تھا اور اس کے علاوہ دجلہ کے دائیں ساحل پر حترا یا شہر الحضر ابھی اشکانیوں کے قبضہ میں تھا (۶)، اس طرح اشکانیوں کی حکومت کا دائرہ عراق تک وسیع تھا اور وہ اپنی شجاعت کے سبب سلوکیدیوں سے ایران و عراق کا تخت و تاج چھین لینے میں کامیاب رہے، کیونکہ یہ خانوادہ خود کو ھخامنشی سلطنت کا وارث سمجھتا تھا، جس سے مقدونیوں نے اقتدار چھینا تھا، اسی لیے وہ مقدونیوں اور بعد میں رومیوں سے انتقام کو اپنا فرض تصور کرتے تھے۔

عراق میں رومیوں کا داخلہ اور قبضہ: دوسری صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں یونانیوں کی

☆ محولہ کتابوں میں اس کا املا (ط) اور (ت) دونوں سے ہے۔

عظمت و سطوت، داستان پارینہ کی حیثیت اختیار کرچکی تھی، چنانچہ وہ سلطنت جس نے کلی عراق عرب ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کے عظیم خطوں پر اپنے ثقافتی اور تہذیبی نقوش ثبت کیے تھے، اقتدار کے لیے باہمی کشمکش کے نتیجہ میں اشکانیوں (پارتھیوں) کی محکوم ہوگئی، عین اسی زمانہ میں جب رومی اقتدار یونانیوں کو شکست کی دھول چٹاتا ہوا فرات تک وسیع ہوتا جارہا تھا اور ایشیا کو محکوم و مغلوب کرنے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ہر ممکن کوششیں کررہا تھا اسی وقت اس کے خلاف پارتھیا کی ریاست صف آرا ہوتی ہے (۷) اور رومیوں کی پیش قدمی کو روک دیتی ہے (۸)، مورخین نے لکھا ہے کہ متعدد دفعہ رومیوں اور اشکانیوں کے درمیان مقابلہ ہوا مگر ہر بار رومی پسپا ہوئے، ڈاکٹر محمد شرف عالم رقم طراز ہیں:

"اشکانیوں کے دوسرے دور میں رومیوں کے ساتھ تین جنگیں ہوئیں اور تینوں میں اشکانی فاتح رہے بلکہ تیسری جنگ جو اشکانیوں کے دور انحطاط میں ہوئی اس میں ان کی فتح باعث تعجب ہے"۔(۹)

رومیوں کا یہ دیرینہ خواب دوسری صدی عیسوی میں شرمندۂ تعبیر ہوا اور متعدد جنگوں میں اشکانیوں کو شکست ہوئی، ایچ، ایف پیلہم نے اپنی کتاب "تاریخ روما" میں لکھا ہے کہ دیار مشرق میں سلطنت روما کا استحکام رومن فرماں روا پامپی کی ذات سے ہوا (جس کا زمانہ ۶۴-۶۵ قبل مسیح کا ہے) جیسا کہ مغرب میں قیصر کی وجہ سے رومیوں کے قدم جم گئے، پامپی کے زمانہ میں دریائے فرات کے مغرب میں کوئی سلطنت باقی نہ رہ گئی تھی جو رومیوں کے مقابلہ میں مغربی ایشیا کی سیاسی قیادت کی دعوے دار ہوتی، اس خطے میں بادشاہ تو بہت تھے مگر کوئی ایسا طاقت ور فرماں روا نہیں تھا جو رومیوں کا مقابلہ کرتا، دوسرے پامپی نے شاہ پارتھیا کے دعوائے شہنشاہی کو تسلیم بھی نہیں کیا (۱۰)، اس کی خواہش تو یہ تھی کہ رومن سلطنت اور پارتھیا کے درمیان کوئی حد فاصل باقی نہ رہے، چنانچہ عراق کو اس نے اپنی حمایت میں لینے کے لیے شاہ آرمینیا کو جو رومیوں کا حلیف اور دست نگر تھا، چند اضلاع جو برائے نام سلطنت پارتھیا کے ماتحت تھے سپرد کردیے تھے، تاکہ عراق کی شاداب سرزمین رومیوں کے زیر حمایت ہوجائے (۱۱) اور شاہ آرمینیا رومن سلطنت کی راہ ہموار کرسکے، تاہم ایسا اس وقت کچھ نہیں ہوا، اس کے برعکس اہل پارتھیا نے رومن حکومت کے علم بردار لوکینیس کراسس کو ملک عراق میں شکست دے

کراس کو قتل کردیا اور پامپی اور قیصر کی طرح عظیم الشان فتوحات حاصل کرنے کی اس کی آرزو خاک میں ملادی اور اس وسیع خطۂ ملک کو سلطنت روما کے لیے فتح کرنے کے منصوبہ پر پانی پھیر دیا جو دریائے فرات اور دریائے سندھ کے درمیان واقع تھا (۱۲)۔ مختصر یہ کہ عہد پامپی تک رومن اقتدار اپنی تمام تر طاقت کے باوجود دریائے فرات کے علاقہ کو اپنے زیر تسلط نہ کرسکا تھا اور اشکانیوں (پارتھیوں) کے قبضہ سے چھیننے میں کامیاب نہ ہوسکا، حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے بعد دوسری صدی عیسوی کے ابتدائی عشرہ تک عراق کی سرزمین اشکانیوں کے قبضہ میں رہی، البتہ رومن فرماں روا تراجن (ٹریجن)☆ نے اشکانیوں کو عراق سے بے دخل کرنے کا عزم کیا اور انہیں مغلوب کرنے کی پوری تیاری کی (۱۳)، تراجن ایتھنز سے روانہ ہوا، پارتھی حکم راں پارتھیو ماسیرس تراجن کے حملہ کی خبر سن کر گھبرا گیا، اس نے اس حملہ سے بچنے کے لیے تراجن کو متعدد خطوط لکھے اور اس کے مقابلہ میں عجز و درماندگی اور انکساری کا اظہار کیا، اس نے آرمینیہ کی سلطنت سے دست برداری کا معاہدہ کیا اور پارتھی شہزادے نے سر سے تاج اتار کر تراجن کے قدموں میں ڈال دیا (۱۴)، اسی دوران رومن سپہ سالار موسیو کوئی توس اپنے لشکر کے ساتھ مشرق میں پیش قدمی کررہا تھا اور سین گارا کے مشہور و مستحکم قلعہ کو فتح کرچکا تھا، پارتھیا پر حملہ کے نقطۂ نظر سے اس قلعہ کی بڑی اہمیت تھی، خود تراجن مسئلہ آرمینیا کے حل اور اس پر رومن سلطنت کا قبضہ قائم کرنے کے بعد عراق عرب میں داخل ہوا جہاں اس کی کوئی قابل ذکر مزاحمت نہ ہوئی، وہ عراق عرب کے الحاق اور انتظام کے بعد انطاکیہ چلا آیا (۱۵)، اس سال تراجن نے دریائے دجلہ عبور کرکے مزید پیش قدمی کا ارادہ ترک کردیا اور یہ موسم دریائے فرات کے لیے ایک بیڑا تیار کرنے کے اہتمام میں گزرا، جس سے آیندہ پیش قدمی میں مدد ملے، موسم بہار کے آتے ہی تراجن نے سخت مشکلات کے باوجود دریائے دجلہ کو اپنی فوجوں کے ساتھ عبور کیا، رومیوں کو روکنے کے لیے دوسرے کنارے پر کارودکی نامی قبائل جو دریائے دجلہ کے قریبی پہاڑوں کے باشندے تھے، موجود تھے لیکن رومی فوجوں کی کثرت کے سبب تراجن کا مقابلہ کیے بغیر یہ پہاڑی وحشی قبائل پیچھے ہٹ گئے، دریائے دجلہ پار کرنے کے بعد تراجن اپنے فرات کے بحری بیڑے سے جاملا، پہلے اس نے ازوگارونا نامی مقام پر اپنی فوج کا جائزہ لیا جہاں سے اہل بابل اپنی عمارتوں کی تعمیر کے لیے چونا گچی لے جاتے تھے،

☆ عربی کتابوں میں "تراجن" اور انگریزی کی مترجمہ کتابوں میں "ٹریجن" مرقوم ہے۔

خانہ جنگیوں کے سبب بہت سے باشندگان بابل شہر چھوڑ کر جاچکے تھے، اس لیے یہ شہر بہ آسانی رومیوں کے قبضہ میں آگیا (۱۶) لیکن بابل و جزیرہ کے جو علاقے بہت آسانی سے تراجن نے فتح کیے تھے تھوڑے ہی دنوں میں باغی ہوگئے اور سپہ سالار ماکسی موس کو مع رومی فوج فنا کے گھاٹ اتار دیا اور نصیبین، سلوکیہ اور ادیسہ کی رومی فوجوں کو مار بھگایا، اس بغاوت میں یہودیوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا، بڑی مشکل سے بغاوت فرو ہوئی اور بڑے بڑے شہروں کو اس بغاوت کا خمیازہ بھگتنا پڑا، بابل کے علاقے میں شہر سلوکیہ، کلاروس اور جولیوس الکونڈر نے دوبارہ تسخیر کرکے نذر آتش کردیا اور جزیرہ کے علاقے کی دوبارہ فتح کے لیے مورلوسیوس کوئی توس کو مامور کیا گیا، اس نے محاصرہ کرکے انہیں مغلوب کیا (۱۷) اور اس طرح دریائے دجلہ و فرات کے علاقے رومیوں کے قبضہ میں بڑی مشکل سے آئے، اس بغاوت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ تراجن کو دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کا منصوبہ ترک کرنا پڑا، ۱۱۵ء میں ٹریجن نے بلا مزاحمت عراق عرب کے شمالی حصہ پر قبضہ کرلیا اور بابل وغیرہ فتح کرکے اپنی سلطنت میں داخل کرلیا لیکن یہودیوں کی مخالفت و بغاوت سے اس کو عراق میں متعدد الجھنوں کا شکار بھی ہونا پڑا (۱۸)۔

ساسانیوں کا اقتدار: تیسری صدی عیسوی سلطنت روما کے لیے بڑے مسائل لے کر آئی، بہ طور خاص رومن سپہ سالار جانشینوں کے خلاف فوجی اور سپاہیانہ بغاوت نے پوری سلطنت روما کو ایسا بے بس کردیا تھا کہ رومن شاہنشاہوں کے لیے ان پر قابو پانا مشکل ہوگیا، ۲۳۸-۲۳۷ء میں چھ بادشاہ چند مہینے میں قتل کیے گئے، گالی انیس (۲۶۰-۲۶۸ء) کے عہد حکومت میں سلطنت کی حالت نہایت نازک ہوگئی اور مرکزی حکومت بالکل ہی بے دست و پا ہوگئی (۱۹)، مزید ابتری اس وجہ سے بھی آئی کہ ایک طرف رقیب سپہ سالار حصول جاہ قیصری کے لیے باہم دست و گریباں تھے اور دوسرے طرف سلطنت کے نظام کو بیرونی حملوں نے تہ و بالا کردیا تھا، دوسری صدی عیسوی کے اختتام پر گو کہ اشکانی سلطنت کے روز افزوں انحطاط سے یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب رومیوں کو کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا مگر اسی زمانہ میں ایرانی النسل ساسانی خاندان بھی ابھر کر سامنے آرہا تھا، یہ خاندان اپنے اسلاف کے گذشتہ مقبوضات کی بازیافت کے لیے کوشاں اور چاہتا تھا کہ وہ تمام صوبہ جات جو کیخسرو اور دارا کے زمانہ میں حکومت ایران کے تحت تھے اور جن پر اب مغرب یعنی

رومی متصرف تھے انہیں دوبارہ اپنے قبضہ میں لائیں (۲۰)، ساسانی سلطنت کا موسس اول اردشیر ہے، اس کے جد اعلا کا نام ساسان تھا، اسی لیے اس خانوادے کو ساسانی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، اردشیر نے شاہ اشکانی اردوان پنجم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس سے متعدد بار جنگیں کر کے شاہ اشکانی کو قتل کر ڈالا اور تیسفون پر تصرف و تسلط حاصل کر لیا (۲۱) اور چھوٹے چھوٹے سرداروں کو مطیع کیا، ۲۲۶ء میں تیسفون کو فتح کرنے کے بعد پورا ایران اس کے زیر نگیں ہو گیا، ایرانی علاقوں اور صوبہ جات ایشیا پر تصرف حاصل کرنے کے بعد اردشیر نے رومیوں سے جنگ کا منصوبہ بنایا، جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے کہ ساسانی خانوادہ ایشیا میں رومیوں کی دخل اندازیوں کو بے جا سمجھتا تھا، چنانچہ ۲۳۰ء میں اردشیر نے ایشیائی علاقوں کو سیویرس الگزنڈر سے واپس طلب کیا اور نہ صرف عراق پر حملہ کر دیا جو اس وقت رومن سلطنت کے قبضہ میں تھا بلکہ شام کی طرف بھی پیش قدمی کر دی (۲۲)، اس کے بعد اس کے جانشین شاپور نے زمام حکومت سنبھالی اور تخت نشین ہوتے ہی ایک منظم فوج ترتیب دی، تاکہ رومیوں سے فرات و دجلہ اور بین النہرین کے علاقے چھین سکے، چنانچہ اس نے ۲۶۰ء میں ویلیرین شاہ روم کو شکست فاش دے کر ستر ہزار رومی سپاہ کو قید کر لیا (۲۳)، ڈاکٹر شرف محمد عالم لکھتے ہیں:

"شاپور اول کے عہد کا اہم ترین واقعہ رومیوں کی شکست فاش اور قیصر روم والرین (ویلیرین) کی گرفتاری ہے، روم و ایران کی جنگوں کا یہ سلسلہ ۲۵۸ء سے ۲۶۰ء تک جاری رہا، اس جنگ میں بہت سارے رومی سپاہی گرفتار ہوئے، ان سپاہیوں سے شوشتر کے پاس دریا پر ایک بند بندھوایا گیا جو بند شادرواں کے نام سے موسوم ہے، کہا جاتا ہے کہ گرفتاری کے بعد والرین کو ذلت آمیز اذیتیں دی، اس فتح کی یادگار میں شاپور نے نقش رستم میں ایک کتبہ کندہ کرایا جس میں شاپور گھوڑے پر سوار ہے اور والرین اس کے قدم چومنے کو آگے کو جھکا ہوا ہے"۔ (۲۴)

ساسانی خانوادہ کے اولین حکمرانوں میں اردشیر اور شاپور دو ایسی شخصیتیں ہوئیں جنہوں نے اس خانوادہ کا نام تاریخ عالم کے صفحات پر زندۂ جاوید کر دیا، شاپور کے عہد حکومت میں مانی کا ظہور ہوا (۲۵) لیکن ایران بہ عہد ساسانیاں کے مصنف نے اس کے برعکس لکھا ہے کہ خود مانی کا کہنا

ہے کہ اردشیر اول کے عہد میں اس نے ہندوستان کا سفر کیا، تاکہ وہاں کے لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دے (۲۶)، اس بیان سے یہ دعوا مشکوک ہو جاتا ہے، تاہم تیسری صدی عیسوی میں مانی مذہب کے وجود سے بہ ظاہر انکار کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ خود مانی نے اپنی تصنیف شاپورگاں کو شاپور اول کے نام معنون کیا ہے (۲۷)، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب مانی کے بانی مانی کا ظہور اور اس کے مذہب کی اشاعت تیسری صدی عیسوی کے نصف اول میں ہو چکی تھی۔

شاپور نے ۲۷۲ء میں وفات پائی، اس کے بعد اس کے دو بیٹے یکے بعد دیگرے تخت سلطنت پر متمکن ہوئے، ہرمز اول (۲۷۲-۲۷۳ء) اور بہرام اول (۲۷۳-۲۷۶ء)، اول الذکر کی حکومت صرف ایک سال بتائی جاتی ہے اور بہرام اول نے تقریباً سوا تین برس حکومت کی، اس کے بعد اس کا لڑکا بہرام دوم تخت نشیں ہوا، اس نے ۲۷۶-۲۹۳ء تک تقریباً سترہ برس حکومت کی، اس کے عہد حکومت میں روم کے ساتھ پھر جنگ چھڑ گئی اور قیصر کیروس اپنے لشکر جرار کے ساتھ تیسفون تک آ پہنچا لیکن اس کی اچانک موت کے سبب رومیوں کو واپس جانا پڑا، ۲۸۳ء میں ایران اور روم کے درمیان معاہدہ ہوا جس کے مطابق آرمینیا اور میسوپوٹیمیا روم کے قبضے میں آ گئے (۲۸)، ۲۹۳ء میں بہرام دوم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے بہرام سوم نے زمام حکومت سنبھالی لیکن اس نے صرف چار مہینے حکومت کرنے کے بعد شاپور اول کے بیٹے نرسی سے شکست کھائی (۲۹)، نرسی کے ساتھ رومیوں کی جنگ میں میدان رومیوں کے ہاتھ رہا اور رومی بادشاہ قیصر گیلیریوس نے بہ ذات خود نرسی پر حملہ کیا اور اس کی ملکہ ارسان کو رومیوں نے گرفتار کیا جس کے عوض نرسی کو ارمنستان کو چک کے پانچ ضلعے روم کے حوالے کرنے پڑے (۳۰) لیکن بعض دوسرے مورخین کے مطابق رومی نرسی کے مقابلے میں جیتے بھی اور شکست سے بھی دوچار ہوئے (۳۱)، باہمی جنگ و جدل کے بعد ۲۹۷ء میں دونوں ملکوں کے مابین صلح ہوئی، اس صلح کے مطابق فرات و دجلہ کا جزیرہ اور دجلہ کے مشرق کی پانچ ایالتیں (صوبے) روم کے قبضے میں گئیں اور دریائے دجلہ کو ایران و روم کی حد قرار دے دیا گیا (۳۲)، اس کے بعد ساسانی خانوادہ میں شاپور دوم کا نام مدت حکومت اور نظم مملکت کے لحاظ سے خاصا اہم ہے، مورخین نے اس کے عہد حکومت کو ۷۰ برس پر محیط بتایا ہے اور اس کا لقب "ذوالاکتاف" یعنی کندھوں والا لکھا ہے، تاریخ ابن خلدون میں

مذکور ہے کہ عربوں کے خلاف لڑائی میں وہ ان کے کندھے اکھاڑ لیتا تھا، اسی لیے عربوں نے اس کو ذو الاکتاف کا لقب دے دیا تھا، سابور بن هرمز انه كان يخلع اكتاف العرب ولذلك لقبه العرب ذو الاكتاف (۳۳)، ڈاکٹر شرف عالم کی تحقیق کے مطابق عنان حکومت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے اس (شاپور دوم) نے عرب حملہ آوروں کا استیصال کیا اور انہیں سخت سزائیں دیں، جنگ میں انہیں شکست دے کر اس نے بدوی عرب قیدیوں کے کندھوں میں سوراخ کروا کر اس میں ڈور پرونا کر کھنچوایا، اسی لیے اسے ذو الاکتاف کہا جاتا ہے لیکن ہمارے خیال میں نولڈکہ (نولڈیکی) کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے کہ اصل میں یہ ایک اعزازی لقب تھا جس کے معنی فراخ شانوں والا یعنی وہ شخص جو سلطنت کے بھاری بوجھ اٹھا سکے (۳۴)، شاپور بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھا، اس کی ذہانت و حسن فہم کا ایک واقعہ طبری نے یہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ وہ بطیسبون (تیسفون) کے شاہی محل میں سو رہا تھا کہ لوگوں کے شور و غوغا سے اس کی آنکھ کھل گئی، اس نے لوگوں سے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ دجلہ کے پل پر آنے جانے والے افراد کا ازدحام ہے اور راستہ بہت تنگ ہے، اسی لیے یہ شور ہو رہا ہے، نو عمر بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ ایک دوسرا پل تعمیر کر دیا جائے کہ ایک آنے والوں کے لیے مخصوص ہو اور دوسرا جانے والوں کے لیے، اس صورت میں بھیڑ نہ ہوگی اور شور بھی نہیں ہوگا۔ (۳۵)

شاپور کے سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے اس کی ماں ۱۶ برس تک حکومت کا نظم و نسق دیکھتی رہی اور اس کی نائب السلطنت کی حیثیت سے کام کرتی رہی، اس کے زمانہ میں بدامنی پھیلی اور عربوں اور دوسرے قبائل نے ملک پر حملے کیے لیکن زمام حکومت سنبھالنے کے بعد وہ خود بھی کئی سال روم کے ساتھ انتقام کی جنگ نہ لڑ سکا اور سلطنت کی اندرونی مشکلات پر قابو پانے میں مصروف رہا، طبری نے عرب قبائل پر اس کی فتوحات کا ذکر کیا ہے (۳۶)، روم کے ساتھ شاپور کی جنگوں کے سلسلے ۳۳۸ء سے ۳۵۰ء تک اور پھر ۳۵۹ء سے ۳۶۳ء تک جاری رہے۔ (۳۷)

مورخین نے اس کے عہد میں ایران و روم کی صلح کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے، جس میں رومی شہنشاہ کو پیچھے ہٹنا پڑا اور نرسی (ایرانی بادشاہ) کے عہد حکومت میں جو پانچ ایالتیں (صوبے) رومی مقبوضات میں چلی گئی تھیں، وہ شاپور کے قبضہ میں واپس آ گئیں، اس کے نتیجہ میں دجلہ کے

بجائے فرات کو سرحد تسلیم کیا گیا (۳۸)، ایران بہ عہد ساسانیاں کے مصنف نے لکھا ہے کہ شاپور کے آبا و اجداد نے اپنی سلطنت کی وسعت کو سٹریمون اور مقدونیہ کی سرحد تک پہنچا دیا تھا اور وہ آرمینیہ اور میسوپوٹیمیا کے صوبوں کی بازیافت کو جنہیں اس کے جد سے رومیوں نے چھین لیا تھا اپنا فرض تصور کرتا تھا، آرمینیہ کی خانہ جنگیوں نے اس کو یہ موقع فراہم کر دیا اور اس نے اس پر قبضہ کر کے میسوپوٹیمیا میں رومیوں سے صف آرائی کی اور فتح حاصل کی۔ (۳۹)

عہد نوشیرواں: شاہان ساسان میں خسرو اول یا نوشیرواں عادل بہت نامور بادشاہ گذرا ہے، وہ چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول میں تخت نشین ہوا، زمام حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے روم سے جنگ کرنا غیر ضروری خیال کیا، چنانچہ دونوں میں ۵۳۳ء میں صلح ہوئی جس میں ایک شرط یہ تھی کہ ایران و روم باہم متحد رہیں گے لیکن نوشیرواں اس صلح کو ایک سیاسی چال تصور کرتا تھا اور اپنے آپ کو چوکنا رکھتا تھا، رومی قیصر ژوستی نین کے زمانے میں جب روم نے دو عرب بادشاہوں کے جھگڑوں میں دخل اندازی کی تو نوشیرواں نے اس کی دخل اندازی کو بے جا خیال کیا اور ایک بڑی فوج لے کر بین النہرین اور دریائے فرات کو عبور کرتا ہوا شامات تک گیا اور مغربی ایشیا کے عروس البلاد انطاکیہ کو مسخر کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، پھر رومی حکومت نے عارضی طور پر صلح کر لی لیکن ۵۴۰ء سے پھر جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ۵۵۷ء تک جاری رہا، اس طویل جنگی کارروائی کے بعد ۵۶۲ء میں روم اور ایران کے درمیان پچاس سالہ صلح ہوگئی اور نوشیرواں اطراف ایران کو فتح کرنے میں مصروف ہوگیا، اس کی پیہم فتوحات سے رومیوں کی نیند حرام ہوگئی اور ۷۰ سالہ نوشیرواں کو کمزور سمجھ کر انہوں نے ایرانی علاقوں پر حملے شروع کر دیے، ۵۷۶ء میں رومیوں کو پھر شکست ہوئی، ۵۷۸ء میں ایران و روم کی فوجیں ایک دوسرے کے علاقوں میں غارت گری میں مصروف ہوگئیں، یہاں تک کہ نوشیرواں جو اس وقت رومی فوج کے تعاقب میں تھا، صورت حال پر قابو پانے اور جنگی بندوبست کے لیے اپنے پایہ تخت تیسفون گیا، جہاں ۵۷۹ء میں اپنے محل طاق کسریٰ میں اس کا وقت آخر آ گیا (۴۰)، تیسفون جیسا کہ سطور بالا میں گذر چکا ہے دجلہ کے مشرق پر واقع تھا اور چونکہ یہ وہی عراق عرب کا علاقہ ہے جس کے تاریخ کی تفصیلات ہماری اس تحقیق و جستجو کا اہم حصہ ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارس کی

حکومت کا یہ چوتھا دور جو عموماً ساسانی کہلاتا ہے، عراق عرب کو محیط ہے اور رسول اللہ کی آمد آمد کے وقت یہ علاقہ ایرانیوں (ساسانیوں) کے قبضہ میں تھا، جسے ایرانیوں نے رومیوں سے چھینا تھا، یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اس کو ساسانی سلطنت کے گل سرسبد کسریٰ کے جانشینوں سے حاصل کیا تھا اور اپنے وقت کی سپر پاور سے اپنی روحانی طاقت، دینی وجاہت اور سیاسی حکمت عملی کی بہ دولت کامیابی حاصل کی تھی، ضرورت اس بات کی ہے کہ عصر حاضر میں مسلمانوں کو اپنی اسلامی تاریخ کی جانب لوٹنے کی ترغیب دی جائے اور اپنے اسلاف کے وہ نقوشِ پا تلاش کیے جائیں جو انہیں رتبہ بلند تک پہنچائیں اور اسلام کے موثر تعارف کا ذریعہ ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ موجودہ عالمی سیاسی بحران کا خاتمہ اسلامی تعلیمات کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے، دنیا نے بہت سے مذہبی، معاشرتی اور سیاسی نظریے آزما لیے ہیں، نتائج کے اعتبار سے یہ سب دیرپا افادیت سے یکسر خالی پائے گئے، خواہ پاپائیت ہو یا اشتراکیت، شہنشاہیت ہو یا مارکزم۔

اب آیئے سرزمین عراق کی تاریخ کے وہ اوراق پلٹے جائیں جو وہاں اسلام اور مسلمانوں کی آمد اور ان کی آبادکاری سے متعلق ہیں، اہل علم واقف ہیں کہ ایک زمانے میں ملک عراق مسلمانوں کی حکومت وسلطنت مرکز تھا، اس کی مرکزیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کے سلاطین کو اپنی حکومت وسلطنت چلانے کے لیے اجازت خلافت بغداد ہی سے حاصل کرنا پڑتی تھی، اس کے بغیر عام مسلمان کسی فرماں روا کی حکومت تسلیم نہیں کرتے تھے، یہ بھی حقیقت ہے کہ جو سرزمین عرصہ دراز تک ایرانیوں، رومیوں اور دوسری قوموں کی محکوم رہی جب مسلمانوں کے زیر نگیں ہوئی تو انہوں نے اس کو وہ جلال وتمکنت بخشا اور اس کو وہ علم دینی اور قدیم سائنسی ترقیات کا ایک ایسا چمن زار بنا دیا جس کی عطر بیزیاں صدیوں تک اقصائے عالم میں محسوس کی جاتی رہیں، علم وفن کی ترقی میں بغداد کا جو حصہ ہے اس سے علمی دنیا بہ خوبی واقف ہے۔ (باقی)

حوالے

(۱) اشکانی سلطنت کو پارتھیا بھی کہتے ہیں (تاریخ سلطنت رومہ، باب ہشتم، ص ۱۶۹، جے بی بیوری مترجمہ اردو سید ہاشمی، مطبوعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن (۲) ج ۲، ص ۲۰۴، مطبوعہ بریل لائیڈن، ۱۸۸۰-۱۸۸۲ (۳) دنیا کے بڑے مذاہب، ص ۱۸۰، عمادالحسن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی (۴) ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی، لسانی تاریخ، ص ۱۲۶-۱۲۸ (۵) ایضاً ص ۱۳۱ (۶) ایضاً ص ۱۴۴-۱۴۵ (۷) یونانی شہنشاہیت، ص ۱۸۴، مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، ۱۹۲۴ء، ولیم اسکاٹ فرگسن، (ترجمہ اردو) محمد عنایت اللہ (۸) ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی، لسانی تاریخ، ص ۱۴۰ (۹) ایضاً ص ۱۳۹ (۱۰) ایضاً ص ۳۲۴، حصہ چہارم، ترجمہ اردو حمید احمد انصاری، مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۲ء (۱۱) ایضاً ص ۳۲۶ (۱۲) تاریخ روما، ص ۳۲۷ (۱۳) تراجن نے ۱۱۵ء میں ان مشرقی علاقوں کی تسخیر کے لیے روانگی اختیار کی تھی (دیکھیے تاریخ سلطنت روما، باب ۲۴، ص ۶۸۵ (۱۴) تاریخ سلطنت روما، باب ۲۴، ص ۶۸۵، جے، بی، بیوری ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی، مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء (۱۵) ایضاً ص ۶۸۷ (۱۶) تاریخ سلطنت روما، باب ۲۴، ص ۶۸۸ (۱۷) ایضاً ص ۸۹، (۱۸) تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ روما، حصہ ششم، ص ۵۶۲ و مابعد (۱۹) ایضاً ص ۵۷۶ و مابعد (۲۰) ابن خلدون نے بھی اردشیر ساسانی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے آبا کے ملک (مقبوضات واپس لینے کا ارادہ رکھتا تھا، "قام اردشیر فی اھل فارس یرید الملک الذی کان لآبائہ قبل الطوائف" (تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۱۷۰، دارالطباعۃ عامرہ مصر، ۱۲۸۴ھ) (۲۱) ایران صدیوں کے آئینہ میں، ص ۱۴ و تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۱۶۹ (۲۲) تاریخ روما، حصہ ششم، ص ۵۸۰ (۲۳) ایران صدیوں کے آئینہ میں، ص ۱۵ (۲۴) ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی، لسانی تاریخ، ص ۱۵۹ و ایران بہ عہد ساسانیاں، ص ۲۸۸، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۷ء (۲۵) طبری، ج ۲، ذکر شاپور، ص ۸۳۰ و ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی، لسانی تاریخ، ص ۱۶۰ (۲۶) ایضاً ص ۲۳۷ (۲۷) ایضاً ص ۲۶۰ (۲۸) ایران بہ عہد ساسانیاں، ص ۲۹۴ (۲۹) ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی ولسانی تاریخ، ص ۱۶۱ (۳۰) ایران بہ عہد ساسانیاں، ص ۲۹۹-۳۰۰ (۳۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی ولسانی تاریخ، ص ۱۶۲ و مابعد (۳۲) ۱۶۲ (۳۳) تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۱۷۳ (۳۴) ایران بہ عہد ساسانیاں کے حاشیہ میں دیکھیں ص ۳۰۳ (۳۵) طبری، ج ۲، ص ۸۳۷ (۳۶) دیکھیے، طبری، ج ۲، ص ۸۳۸، ۸۳۹ (۳۷) ایران کی علمی، ثقافتی اور لسانی تاریخ، ص ۱۶۳ (۳۸) ایضاً ص ۱۶۴ (۳۹) ایضاً ص ۳۰۴-۳۰۵ (۴۰) ایضاً ص ۱۷۹

مولانا فراہیؒ کے دو غیر مطبوعہ تاریخی خطوط

(کلکتہ ورنگون سفر کے حوالے سے)

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی*

مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۲-۱۹۳۰ء) کی دینی وعلمی بالخصوص قرآنی خدمات ایک خاص امتیاز رکھتی ہیں، برصغیر کی مشہور قدیم دینی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڈھ) سے ان کی گہری وابستگی اور اس کی توسیع وترقی کے لیے ان کی مساعی جمیلہ ان ہی خدمات کا حصہ ہیں، مولانا فراہی مدرسہ کے قیام (۱۹۰۸ء) کے ابتدائی دور سے ہی اس کے کاموں میں دل چسپی لیے رہے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۰ء تک (باستثناء دو برس ر ۱۹۱۴-۱۹۱۶ء) وہ مدرسہ کے ناظم رہے، ۱۹۱۹ء میں دار العلوم، حیدر آباد کی پرنسپلی کی ذمہ داریوں سے سبک دوشی کے بعد انہوں نے اپنی ساری توجہات مدرسہ کی خدمت کے لیے مرکوز کردیں، مدرسہ کی نظامت کے دوران اس کے نصاب تعلیم، طریق تعلیم اور نظام تربیت کی اصلاح، مالی حالت کی بہتری اور اس ادارہ کی مجموعی ترقی کے لیے انہوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ بہت معروف ہیں، مولانا فراہی کے ممتاز سوانح نگار ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صاحب کے بقول "حیدر آباد سے واپسی کے بعد مولانا نے مدرسۃ الاصلاح کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا اور اس کو ایک مکتب یا معمولی درجہ کے مدرسہ سے اٹھا کر ایک تعلیمی تحریک اور فکری انقلاب کا مرکز بنادیا"۔ (ذکر فراہی، دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڈھ، ۲۰۰۱ء، ص ۴۵۰)

مدرسہ کے لیے مولانا فراہی کی خدمات جلیلہ پر اس واقعہ سے بھی شہادت ملتی ہے کہ انہوں نے ضعف وپیرانہ سالی کے باوجود مدرسہ کے کام سے ۱۹۲۴ء میں رنگون (برما) کا سفر کیا، ان کا یہ سفر کلکتہ کے راستہ سے ہوا اور وہاں بھی مدرسہ کے کاموں کے سلسلہ میں کئی روز قیام فرمایا، مولانا

* صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

کے رفیق سفر حاجی حسن علی (ساکن رواں، اعظم گڈھ) مدرسہ کے طالب علم مولوی زین الدین (ساکن فتح پور، تال رتوئے) اور بعض دیگر اشخاص تھے لیکن ان کے ناموں کا سراغ نہیں مل سکا، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صاحب کے بیان کے مطابق اس سفر میں رفاقت کے لیے مولانا فراہی کی نظر انتخاب سب سے پہلے اپنے تلمیذ عزیز مولانا امین احسن اصلاحی پر پڑی تھی لیکن مولانا اصلاحی کی بعض ناگزیر مصروفیات اس میں حارج آگئیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے "یاد رفتگاں" میں اور مولانا امین احسن اصلاحی نے صاحب "ذکر فراہی" سے ذاتی ملاقاتوں میں مولانا فراہی کے برما سفر کا ذکر کیا ہے اور اس سفر سے متعلق بعض دیگر زبانی روایتیں معروف ہیں اور خطوط میں بھی اس کے حوالے دست یاب ہیں لیکن ان میں سے کسی ماخذ سے مولانا کے برما سفر اور وہاں قیام کی قطعی تاریخوں کا تعین دشوار معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر شرف الدین صاحب نے "ذکر فراہی" میں ان تمام تحریروں اور زبانی روایتوں کے حوالہ سے مولانا کے اس سفر کی تفصیلات تقریباً چار صفحات (۴۳۲-۴۳۵) میں پیش کی ہیں لیکن واضح ثبوت کی عدم دست یابی کی وجہ سے سفر کی ابتدا اور رنگون میں قیام کی تاریخوں کے تعین میں دشواری ظاہر کی ہے، حسن اتفاق کہ ۱۵/اپریل ۲۰۰۸ء کو لکھنؤ میں مولانا فراہی کے پوتے اور اپنے قدیم کریم فرما برادر مکرم پروفیسر عبید اللہ فراہی صاحب سے ملاقات کے دوران ان کی عنایت سے مولانا فراہی کے دو غیر مطبوعہ خطوط (پوسٹ کارڈ پر تحریر کردہ) دیکھنے کو ملے جسے انہوں نے کلکتہ ورنگون قیام کے دوران اپنے برادر عزیز حاجی رشید الدین صاحب کو ارسال کیے تھے، ان خطوط سے مولانا فراہی کے کلکتہ ورنگون سفر اور وہاں قیام کے مدت کی تعیین میں مدد ملتی ہے اور ان سے ان دونوں شہروں میں ان کی مصروفیات کے بارے میں بعض قیمتی ومفید معلومات سامنے آتی ہیں، اس لحاظ سے یہ خطوط تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، ان کا متن اور ان سے اخذ کردہ معلومات پیش کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا، پہلے ان کے متن ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مکتوب از کلکتہ:

برادرم رشید الدین سلمہ ربہ واعزہ

بحمدہ تعالی ہم لوگ بخیریت ہیں، ابھی یہاں ہفتہ عشرہ اور ٹھہرنا ہوگا، کام کا ڈول ڈالا جارہا ہے، ارباب حل وعقد کلکتہ ساتھ دے رہے ہیں، میرا کام اور ہے اور میرے رفقا کا کام اور ہے، وہ

چندہ کی کوشش کر رہے ہیں اور میں تعلیم قرآن اور تمام اصلاح کا کام اسی سے وابستہ ہونا سمجھا رہا ہوں
ابوالکلام طیار ہو گئے ہیں اور سرائے میر میں آکر کچھ روز قیام کر کے اس کام میں شرکت کریں گے،
اس امر کو تسلیم کرلیا ہے کہ یہی اصل کام اور ہمہ تن اسی میں مصروف ہونا چاہیے، وہ میرے ساتھ بالکل
ہم خیال ہو گئے ہیں اور موجودہ مصروفیتوں کو چھوڑ کر میرے ساتھ شریک ہونے کو طیار ہیں۔

وہاں کی خیریت اور حالات سے برابر مطلع کرتے رہو، دو چار روز کے بعد ایک کارڈ لکھ دیا کرو۔

سر دست یہ پتہ ہے، مسجد حافظ عبدالکریم صاحب، نمبر ۵ گینڈہ تالاب، کلکتہ۔

حاجی صاحب کے گھر اطلاع بھیج دینا کہ خیریت سے ہیں اور خوش ہیں، کل ابوالکلام
سے وہ ملاقات کرنے گئے تھے اور خوش خوش واپس آئے۔

حمیدالدین

خط روانہ شد یکم فروری ۱۹۲۴ء

(۲) مکتوب از رنگون:

۱۴رفروری ۱۹۲۴ء

از مکان نمبر ۳۲، کمرہ نمبر ۲۰

فریزر روڈ، رنگون

برادر عزیز سلمہ، بحمداللہ کل بہ وقت مغرب ہم لوگ رنگون میں پہنچ گئے اور آفیشل داخلہ
ہوا یعنی قومی استقبال عامہ مسلمانان ہوا، یہاں کے عمائد ملنے آرہے ہیں، آرام سے یہاں مقیم
ہیں، ہمارے اطراف کے لوگ ملے اور اچھے ہیں اور دل و جان سے خوش ہیں اور امداد مدرسہ کے
لیے آمادہ ہیں، تعلیم قرآن اور اصلاح اصلی کی نشر و تبلیغ کے لیے عام تقریر کرنے کا ارادہ ہے،
یہاں زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ نہیں، وہاں کی خیریت سے مطلع کرنا، پتہ یہ ہے: فریزر روڈ، جمن
منزل، نمبر ۳۲، کمرہ نمبر ۲۰، رنگون۔

سب کو سلام و دعا،　　حمیدالدین

ان خطوط سے مولانا فراہی کے کلکتہ و رنگون سفر سے متعلق جو اہم و مفید معلومات اخذ
ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

۱- پہلے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا فراہی جنوری ۱۹۲۴ء کے آخر میں کلکتہ کے لیے

مولانا فراہی کے دو خطوط

معارف ستمبر ۲۰۰۸ء

روانہ ہوئے ہوں گے، اس لیے کہ یہاں سے یکم فروری ۱۹۲۴ء کو اپنے بھائی حاجی رشید الدین
صاحب کو خط لکھا ہے، جس میں کلکتہ کی مصروفیات کا تذکرہ ہے اور یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ابھی
ہفتہ عشرہ یہاں اور ٹھہرنا ہوگا، اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ مولانا یکم فروری سے
چند روز قبل یہاں پہنچ چکے تھے۔

۲- کلکتہ قیام کے دوران مولانا نے اپنے گھر جو خط لکھا ہے اس میں خط و کتابت کے
لیے "مسجد عبدالکریم (گینڈہ تالاب) کا پتہ دیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے یہیں
قیام فرمایا لیکن ڈاکٹر شرف الدین صاحب کے بیان کے مطابق "مولانا فراہی کلکتہ پہنچے تو مولانا مدنی
(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی) کے پاس مسجد ناخدا میں قیام فرمایا جہاں مولانا مدنی پڑھاتے
تھے" (ذکر فراہی، ص ۲۳۳)، اس بیان کی صحت تحقیق طلب ہے، اس لیے کہ یہ بہ خوبی معروف ہے
کہ دونوں مسجدیں کلکتہ شہر میں الگ الگ مقام پر واقع ہیں، دوسرے کلکتہ میں مولانا مدنی کی تدریسی
مصروفیت کے سلسلہ میں بعض کتابوں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انہوں نے ۱۳۳۹ھ (مطابق ۲۰-
۱۹۲۱ء) میں کچھ عرصہ مدرسہ عالیہ میں تدریسی فرائض انجام دیے (قاری محمد طیب، مرتب: حافظ
اکبر شاہ بخاری، دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، دارالکتاب، دیوبند، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۹)،
یہاں یہ پیش نظر رہے کہ کلکتہ میں مولانا فراہی کے قیام کا واقعہ ۱۹۲۴ء سے تعلق رکھتا ہے۔

۳- دوسرے خط کی روشنی میں قرین قیاس یہی ہے کہ کلکتہ سے برما کے لیے ان کی
روانگی فروری کے دوسرے ہفتہ (یا ۶، ۷رفروری کے آس پاس) ہوئی، اس لیے اس خط کے
مطابق وہ ۱۳رفروری کو رنگون پہنچے اور بعض واقف کاروں سے معلوم ہوا کہ اس وقت پانی کے
جہاز سے ہندوستان سے برما کا سفر ۷ دنوں میں طے ہوتا تھا۔

۴- ان خطوط سے مولانا فراہی کی ڈائری کے نوٹ (محولہ در "ذکر فراہی"، ص ۴۳۵)
میں مندرج "وقت سفر رنگون ۷رجنوری ۱۹۲۵" غلط معلوم ہوتا ہے، ڈائری کے اس نوٹ سے
متعلق ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صاحب نے خاص طور سے مرقومہ سن (۱۹۲۵ء) کے حوالہ سے
یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ "یا تو تاریخ کے اندراج میں کسی سے غلطی ہوگئی ہے...... یہ بھی ہوسکتا ہے
کہ مجھ سے کسی اندراج میں غلطی ہوگئی ہو، باقی کاغذات تو میں نے دوبارہ سہ بارہ دیکھ کر چیک

کرلیا لیکن محولہ ڈائری تک رسائی میرے لیے اس وقت ممکن نہیں“ (ذکر فراہی، ص ۴۳۵)، زیر بحث خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس ڈائری میں یا اس کے حوالہ سے جو تاریخ (۷ رجنوری) لکھی گئی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ پہلے خط سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مولانا جنوری کے آخر میں وطن سے براہ کلکتہ رنگون کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

۵- دوسرے خط سے یہ قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فراہی اپنے رفقا کے ہمراہ ۱۳ رفروری ۱۹۲۴ء کو رنگون پہنچے اور وہاں ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ استقبال سرکاری سطح پر عوامی نوعیت کا تھا، دوسرے اس خط سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ مولانا اپنی طرف کے لوگوں کے مدرسہ کے لیے تعاون کے جذبہ کے اظہار سے مطمئن وخوش تھے، مولانا کے اس تاثر کی روشنی میں بعض حضرات کی یہ زبانی روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ رنگون پہنچنے پر مولانا نے خواب میں بعض ایسی چیزیں دیکھیں جن سے انہیں یہ شبہ ہوا کہ لوگوں سے چندہ جمع کرنا نہایت ناپسندیدہ کام ہے اور اس کی وجہ سے وہ تین چار روز بعد ہی وطن واپس ہوگئے، مزید براں یہ روایت حاجی رشید الدین صاحب مرحوم کے اس خط (تحریر کردہ یکم مارچ ۱۹۲۴ء) سے بھی غلط ثابت ہوتی ہے جس میں انہوں نے مولانا فراہی کے خط کے جواب میں لکھا تھا ”معلوم ہوا کہ ابھی چندے اور قیام کریں گے ممکن ہے تین چار ہفتہ کی مدت میں اور اضافہ ہو“ (ذکر فراہی، ص ۴۳۵)، حاجی صاحب کے اس خط کی تاریخ (یکم مارچ ۱۹۲۴ء) سے یہ بات واضح ہے کہ اس وقت رنگون میں مولانا کے قیام کو کم از کم دو ہفتہ گزر چکے تھے، اس لیے کہ وہ (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) ۱۳ رفروری کو رنگون پہنچ چکے تھے اور ابھی مزید رکنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

۶- دونوں خطوط سے کلکتہ و رنگون میں مولانا فراہی کی مصروفیات کا یہ خاص پہلو سامنے آتا ہے کہ انہوں نے وہاں لوگوں میں دعوت دین و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ کہ وہ اس کام میں تعلیم قرآن کو بنیادی اہمیت دیتے تھے اور اسی کو اصلاح احوال کا سب سے بہتر و موثر ذریعہ سمجھتے تھے، درحقیقت مولانا فراہی کی فکر اور ان کی علمی وعملی کاوشوں کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ وہ خود علم قرآن کی اشاعت اور فہم قرآن کے فروغ کو اصل کام سمجھتے تھے اور اصحاب علم کو بھی اسی کام میں منہمک رہنے کی دعوت دیتے رہے، یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ مولانا فراہی نے اس فکر کی

بنیاد پر اس مدرسہ کا نصاب وضع کیا اور نظام تعلیم و تربیت مرتب کیے جس کی فلاح و بہبود کی خاطر انہوں نے یہ سفر کیا تھا۔

۷- پہلے خط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کلکتہ قیام کے دوران مولانا فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مابین قریبی روابط قائم ہوئے اور دونوں میں ملاقاتیں رہیں، مولانا فراہی نے مولانا آزاد کے سامنے تعلیم قرآن کے توسط سے امت کی اصلاح سے متعلق اپنا نقطہ نظر ایسے موثر انداز میں پیش کیا کہ انہوں نے مولانا کی فکر سے ہم آہنگی ظاہر کی اور اس بات سے متفق ہوگئے کہ اصلی کام تو قرآن کی تعلیم اور اس کے پیغام کی ترسیل ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر طرف سے یکسو ہوکر اسی کام میں منہمک ہو جانا چاہیے، مزید براں اس خط سے یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ مولانا آزاد تعلیم قرآن سے متعلق مولانا فراہی کے وضع کردہ خطوط پر کام کرنے اور ان سے مزید استفادہ کے لیے کچھ عرصہ سرائے میر (یعنی مدرسۃ الاصلاح) میں قیام کرنے کے لیے بھی تیار ہوگئے تھے لیکن اس ارادہ کے عملی شکل اختیار کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صاحب نے کلکتہ میں دونوں کی ملاقات کی تفصیلات میں یہ ذکر کیا ہے کہ مولانا آزاد اس وقت قرآن کی تفسیر لکھ رہے تھے، مولانا فراہی جب ان سے ملنے گئے تو انہوں نے مولانا کے سامنے قرآن کے بعض اشکالات رکھے، جنہیں مولانا نے آسانی سے رفع کردیے، اس کی وجہ سے مولانا آزاد ان سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ کچھ دن پھریہا میں قیام کرنے اور مولانا سے مزید استفادہ کا ارادہ ظاہر کیا (ذکر فراہی، ص ۴۳۳)، مولانا فراہی کے زیر بحث خط سے مولانا آزاد سے ان کی ملاقات کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے ساتھ پھریہا میں نہیں بلکہ سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح پر قیام کا ارادہ رکھتے تھے۔

مولانا فراہی سے مولانا آزاد کے استفادہ کی نسبت سے یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ استفادہ کا یہ سلسلہ کلکتہ میں ملاقات سے بہت پہلے ۱۹۰۵ یا ۱۹۰۶ء میں قائم ہو چکا تھا جب کہ مولانا آزاد ندوہ میں علامہ شبلیؒ کے ساتھ رہتے تھے اور ”الندوہ“ کے معاون ایڈیٹر کی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا فراہی بھی اس زمانہ میں وہاں وقتاً فوقتاً قیام فرماتے تھے اور

قرآن کا درس دیتے تھے، مولانا آزاد مولانا فراہی کے علم و فضل بالخصوص قرآنی علوم میں ان کی مہارت سے بہت متاثر تھے اور ان کے درس قرآن میں شریک ہوتے تھے، مزید برآں وہ اس دوران ان کی صحبتوں سے مستفید ہوتے اور قرآن سے متعلق اپنے اشکالات بھی ان کے سامنے پیش کرتے تھے (سید سلیمان ندوی، یادرفتگاں، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۰، ذکر فراہی، ص ۵۲۹، ۵۳۱)، مولانا سید سلیمان ندوی کا تاثر یہ ہے کہ مولانا فراہی کو قرآن سے جو عشق کامل تھا اس کا اثر مولانا فراہی کی صحبت کے فیض سے مولانا ابوالکلام آزاد میں بھی سرایت کر گیا اور ''یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا''۔ (حیات شبلی، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ۲۰۰۶ء، ص ۴۴۴)

۸-مولانا فراہی کے خطوط سے یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ کلکتہ و رنگون قیام کے دوران وہ اصلاً دعوت و تبلیغ اور قرآنی افکار و تعلیمات کی اشاعت میں مصروف رہے اور ان کے رفقائے سفر چندہ کی فراہمی کا کام کرتے رہے، جیسا کہ پہلے خط میں مولانا نے صاف طور پر تحریر فرمایا: ''میرا کام اور ہے اور میرے رفقا کا کام اور ہے، وہ چندے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں تعلیم قرآن اور تمام اصلاح کا کام اسی سے وابستہ ہونا سمجھ رہا ہوں''۔

۹-ان خطوط سے اس بات کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ مولانا فراہی نے قرآنی فکر کے فروغ اور فہم قرآن کی راہیں ہموار کرنے کو اپنا مشن بنایا اور انہیں جہاں بھی موقع ملا قرآن کے پیغام کو عام کرنے اور اس کی تعلیمات کی اشاعت کو اپنے اوقات کا بہترین مصرف سمجھا اور تحریری و تقریری دونوں صلاحیتوں کو اس کام کے لیے استعمال کیا، اس کے علاوہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے رہے کہ اصلاً یہی کام کرنے کا ہے اور اس میں اپنی صلاحیتوں کو لگانا ان کا بہترین مصرف ہے۔

۱۰-آخری بات یہ کہ یہ خطوط بھی اس زمانہ میں ڈاک کے نظام کی بہتری و تیز رفتاری کی شہادت دے رہے ہیں، رنگون سے مولانا فراہی نے پھریہا جو خط بھیجا تھا، اس پر رنگون کے ڈاک خانہ کی مہر پر ۱۴؍ فروری ۱۹۲۴ء ثبت ہے اور اس خط کے پھریہا پہنچنے پر وہاں کے ڈاک خانہ کی مہر ۱۹؍ فروری کی لگی ہے، یعنی یہ خط رنگون سے پھریہا چھ دن کے اندر موصول ہوگیا۔

اخبار علمیہ

امریکی مصنفہ شیری جونز نے حضرت عائشہؓ کی زندگی پر ''جیول آف مدینہ'' نامی ناول لکھا، جسے امریکی ناشر رینڈم ہاؤس نے مسلمانوں کے شدید ردعمل کے پیش نظر شائع نہیں کیا تھا لیکن سربیا کے بیوبکس نامی ادارے نے اس کی ایک ہزار کاپیاں شائع کیں تو وہاں کے مفتی معمر زکورلک نے کہا کہ یہ کتاب بھی ڈنمارک کے بدنام زمانہ کارٹونی اخبار کے مماثل ہے، لہذا اس پر پابندی عاید ہونی چاہیے، ان کے اس بیان کے بعد بیوبکس نے سربیا کے مسلمانوں سے معافی مانگی اور کتب فروشوں سے کتابوں کے بقیہ نسخے واپس لینے کا اعلان کیا ہے۔

سعودی وزارت تعلیم نے ملک کے تمام اسکولوں کو ہدایت دی ہے کہ چونکہ مخلوط تعلیم پر پابندی ہے اس لیے طلبہ و طالبات کے درجے علاحدہ رکھے جائیں، اگر کسی تعلیمی ادارے نے اس کی خلاف ورزی کی تو اس کو بند کردیا جائے گا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سعودیہ میں خاصی تعداد بین الاقوامی اداروں کی ہے اور ان میں سے بعض میں مخلوط تعلیم بھی ہے، جس کے سبب بعض دفعہ ناخوشگوار واقعات رونما ہوجاتے ہیں، اب نئی ہدایات کے مطابق طلبہ کے لیے معلمین اور طالبات کے لیے معلمات کا تقرر کیا جائے گا۔

مرکزی حکومت نے ۶ ہزار ۸۰ کروڑ کے صرفے سے بہار، آندھرا پردیش، راجستھان، اڑیسہ، گجرات، پنجاب، ہماچل پردیش اور مدھیہ پردیش میں آٹھ آئی آئی ٹیز کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے، کابینہ نے پہلے تین برسوں کے دوران ہر ادارے میں ۳۰؍ اساتذہ کے علاوہ ڈائریکٹر اور رجسٹرار کے عہدہ کو بھی منظوری دی ہے، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کو قائم کرنے کا مقصد اعلا معیاری تکنیکی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔

اسٹیفن ہاکنگز نے اپنی کتاب ''بریف ہسٹری آف ٹائم'' میں لکھا ہے کہ اگر انسان کائنات کے مختلف طبقات کے درمیان بنائے گئے راستے ورم ہول کے ذریعہ، روشنی کی رفتار سے سفر کرے تو Alpha Centure جس کی دوری زمین سے ۲۰ لاکھ میل ہے، کم ہو کر چند ہی میل رہ جائے گی اور عین ممکن ہے کہ جو وقت اس کو وہاں پہنچنے میں لگا ہے اس سے پہلے دوسرے ورم ہول کے ذریعہ

زمین پر واپس آجائے، سائنس داں کائنات کے مختلف طبقوں کے درمیان ایسٹمک ورم ہول بنانے
میں دن رات مصروف ہیں، تاکہ یہ راستے تسخیر کائنات کے دوران ان کے معاون ہوں، معنٰی
مذکور کے اس سائنسی نظریہ سے واقعۂ معراج کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔

ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی کے ۴؍اگست کے شمارے میں یہ حیرت انگیز خبر شائع ہوئی
ہے کہ ۵۴ برس کا ایک شخص ایک حادثہ میں اپنے دونوں بازوؤں سے محروم ہوگیا تھا، جرمنی کے طبی
ماہرین نے ایک ۱۹؍سالہ جوان جس کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا، اس کے بازوؤں کو اس
معذور میں جوڑ دیا ہے، یہ عمل جراحت ۱۵؍گھنٹے جاری رہا، مریض رو بہ صحت ہے، ڈاکٹروں کا کہنا
ہے کہ مریض کو اپنے بازوؤں کو باقاعدہ استعمال کرنے میں ابھی ۲؍برس لگ سکتے ہیں۔

اپولو مشن ۱۹۷۰ء کے دوران جمع کردہ آتش فشانی ٹکڑوں کے حالیہ تجزیہ میں سائنس
دانوں نے یہ بات کہی ہے کہ چاند خشک سیارہ نہیں ہے بلکہ اس کی سطح کے نیچے پانی بھی موجود ہے،
کیونکہ ان آتش فشانی پاروں میں پانی کے نہایت باریک قطرے پائے گئے ہیں، لہٰذا چاند پر بود
باش کے امکانات کو مزید مضبوط کیا جاسکتا ہے۔

امریکی رسالہ "نیوز ویک انٹرنیشنل" جولائی اگست کے شمارے کی خبر کے مطابق سو ممتاز
ترین دانش وروں میں ۲۰ عالمی دانش وروں کی فہرست تیار کی گئی، اس فہرست میں ہندوستان کی
ایک ارب سے زیادہ آبادی میں صرف دو دانش ور، ایک نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات
امرتیا سین اور دوسرے ممتاز صحافی فرید زکریا، کے نام شامل ہیں، ان کے ناموں کا انتخاب رسالہ
کے ۵ لاکھ قارئین کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔

قزاقستان کے خلائی اڈہ سے کوروٹ نامی خلائی مشن فرانس کی نگرانی میں روانہ ہوگیا ہے
اس کا مقصد سورج سے آگے کے جہانوں کی تلاش ہے، اس میں نصب دوربین بیس ہزار ستاروں
کی نگرانی اور ان کی چمک میں پیدا ہونے والے تغیر کا جائزہ لے گی کہ سیاروں کی دنیا میں کیا کچھ
ہو رہا ہے، یہ مشن ڈھائی برس میں مکمل ہوگا، ماہرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ اس سے ہم خلا
میں زمین جیسے دوسرے سیاروں کا پتہ بھی لگائیں گے۔

ک۔ ص۔ اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب دہلی

بلا ہاؤس، جامعہ نگر،
نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵۔

برادرم جناب مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی

ماہنامہ معارف جولائی ۲۰۰۸ء میں پروفیسر محمد اقبال حسین ندوی صاحب کا گراں قدر
مقالہ "عربی قصہ نگاری" مختصر تعارف نظر سے گزرا، عام طور پر عربی قصہ نگاری کے مقالات مصر یا
کچھ شام ولبنان سے متعلق ملتے ہیں، اس مقالہ میں عراق، سوڈان اور شام ولبنان کے ناول،
افسانہ پر تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے جو ایک اچھی کوشش ہے۔

خاکسار بھی اس موضوع کا طالب علم رہا ہے، اس لیے مقالہ میں جو بعض سہواً غلطیاں رہ
گئی ہیں ان کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں:

(۱) ص ۴۳: پر لکھا گیا ہے کہ بدیع الزماں ہمدانی نے دسویں صدی کے اواخر میں چالیس
مقامات لکھے، اس کی پیروی میں حریری نے بھی مقامات لکھے، مگر تاریخ اللغۃ العربیہ احمد حسن الزیات
کا بیان یہ ہے کہ مقامہ کی ابتدا ابن دُرید نے کی اور چالیس مقامے لکھوائے، اس نے مقامہ کی جگہ
حدیث کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کے بعد بدیع الزماں ہمدانی نے چار سو مقامے لکھے، دوسری جگہ
اسی کتاب میں بدیع الزماں الہمدانی کا بیان ہے کہ بدیع نے اپنے استاذ ابوالحسن احمد بن الفارس
(م ۱۰۰۴ء) سے سیکھ کر چار سو مقامے لکھوائے، اس میں ۵۳ دست یاب ہیں۔

اس کے بعد محمد قاسم بن محلی بصری (م ۵۱۶ھ) نے ۵۰ مقامے لکھوائے، اس کا مطلب
یہ ہوا کہ مقامہ کا اصل موجد ابن دُرید یا احمد ابن الفارس ہے بدیع الزماں الہمدانی نہیں ہے۔

(۲) ص ۴۴: پر سلیم البستانی کی کہانیوں کا ذکر ہے، جن میں الہیام فی جنان الشام مجلۃ الجنان میں قسط وار شائع ہوئیں مگر سلیم البستانی کے ناول زنوبیا کا ذکر نہیں کیا گیا، عربی کا یہ پہلا ناول ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا، یہ پہلے مجلۃ الجنان ہی میں قسط وار شائع ہوا، اس کے بعد الہیام فی جنان الشام اسی مجلّہ میں قسط وار شائع ہوا۔

(۳) ص ۴۴: پر لکھا ہے لبنان اور شام کے سماجی اور سیاسی حالات خراب ہوجانے کی وجہ سے ادبا امریکا اور مصر منتقل ہوگئے، اس میں کہیں برازیل کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ کثیر تعداد میں ادبا مصر کے علاوہ امریکا اور برازیل دونوں جگہ پہنچے، امریکا والے شمالی مہاجرین کہلائے اور برازیل والے جنوبی مہاجرین کہلائے، دونوں نے اپنی ادبی انجمنیں قائم کیں اور عربی ادب کی خدمت انجام دی۔

(۴) اسی صفحہ پر "طہطاوی نے فرانسیسی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا" اگر اس کا عربی نام "مواقع الافلاک فی حوادث تلیماک" بھی لکھ دیا جاتا تو اچھا ہوتا جس طرح دوسرے ترجموں کا عربی نام لکھا ہے۔

(۵) ص ۴۶: پر النظرات کے ساتھ العبرات بھی آجاتا تو مفید ہوتا۔

(۶) ص ۴۷: پر الارواح المتمردہ کا ترجمہ بھٹکتی ہوئی روح نہیں ارواح ہونا چاہیے۔

(۷) ص ۴۸: بالفورس نہیں بالفور ڈیکلریشن ہے، بالفور برطانوی وزیر خارجہ کا نام تھا۔

(۸) ص ۵۱: نجیب محفوظ نے تقریباً ۳۰ ناول لکھے، میرے سامنے نجیب کا خمار القط الاسود، مجموعہ قصصیہ کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء موجود ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے، اس کے ص ۲۲۷ تا ۲۲۹ پر اعمال نجیب محفوظ کی جو فہرست پیش کی گئی ہے، اس میں ۳۵ ناولوں کے نام ہیں، اس کے علاوہ قصص کے مجموعوں کو ملا کر تعداد ۵۵ تک پہنچتی ہے۔

(۹) ص ۵۲: پر ناول (عبد القدر) نہیں عبث الاقدار ہے، ص ۵۱ پر یہی نام صحیح ہے۔

(۱۰) ص ۵۶: پر غستان کنعانی نہیں، کنغآنی ہے۔

شکریہ، نیاز مند

(دکتور) بدر الدین الحافظ

وفیات

آہ! ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا مرحوم

انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا ۱۷ شعبان و رمضان کے قران کے سایے میں اپنے رب کی رحمتوں سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہندوستان میں جن چند اداروں کو مسلمانوں نے اپنے زور وزر سے قائم کیا اور جنہوں نے ترقی اور کامیابی کے سفر میں مسلسل نئی منزلیں طے کیں ان میں ایک نہایت نمایاں نام ممبئی کی انجمن اسلام کا ہے، قریباً یہی بات ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا کے متعلق بھی صادق آتی ہے، جن کی کتاب زندگی کے بعض ابواب کی سرخیاں طب اور سیاست سے روشن ہیں، خلق خدا کی خدمت میں انہوں نے ایک حاذق اور شفیق معالج کی حیثیت سے شہرت پائی، سیاست میں بھی ایک حازم اور خلیق وزیر کی شکل میں ان کی شناخت ہوئی لیکن ان کی اصل خدمت، تعلیم کے میدان میں ممبئی ہی نہیں پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کے سامنے انجمن اسلام کی کارکردگی کو کارنامے میں بدلنا ہے، انجمن اسلام جب ۱۸۷۴ء میں قائم ہوئی تھی تو اس کے بانیوں خصوصاً اس کے پہلے صدر بدر الدین طیب جی کے سامنے یہ اذیت ناک سچائی تھی کہ ممبئی اور پونا کے اعلا تعلیمی اداروں اور مہاراشٹر کے ہائی اسکولوں میں مسلمانوں کی تعداد صفر کے برابر تھی، ۱۸۸۰ء میں ممبئی یونی ورسٹی کے میٹرک میں پاس ہونے والے طلبہ کی تعداد ۲۴۰۷، ۱۵ تھی جن میں مسلمان صرف ۴۸ تھے، انجمن اسلام کے قیام نے اس صورت حال کو کتنا بدلا، یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کی قریب سو سال کی تاریخ میں بدر الدین طیب جی کے بعد متعدد نامور ہستیوں نے اس کی ذمہ داری لی، ان سب میں نسبتاً سب سے کم عمر ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم جب ۱۹۸۳ء میں اس انجمن میں آئے تو واقعی وہ شمع انجمن ثابت ہوئے، میڈیکل پریکٹس کو خیر باد کہہ کر، ان کے جوش عمل اور ولولہ وحوصلہ نے بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں انہوں نے دو یتیم خانوں، ایک کالج ایک پالی ٹیکنیک اور اٹھارہ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کی میراث کو قریب سو اداروں تک پھیلا دیا جن سے ایک لاکھ سے زائد طلبہ فیض یاب ہیں، یونانی میڈیکل کالج، کالج آف مینجمنٹ، انجینئرنگ، پالی ٹیکنیک وغیرہ جدید تکنیکی علوم کے یہ سرچشمے ان مسلمان طلبہ کے لیے سیرابی کا اہم ذریعہ بن گئے جن کی پیاس کے لیے تا حد نظر سراب تھے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے جذبے، محنت اور سب سے بڑھ کر ان کے سوز دروں نے ان کو سرسید ثانی کا لقب دیا اور یہ شاید اس لیے بے جا بھی نہیں کہ تعلیم کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اخلاق و مذہب کی عظمت کا احساس بھی ہمیشہ رہا، اسی لیے انجمن اسلام کی نئی شکل میں تعلیمی رنگ ہی نہیں ثقافتی، سماجی اور سب سے بڑھ کر دین کا رنگ شامل رہا اور اس سے خوب صورت کون رنگ ہوسکتا ہے، تعلیم و تعمیر پر یکساں نظر رکھنے کی صلاحیت نے صرف جدید پروفیشنل کورسز تک تنگ و دو محدود نہیں رکھی، انہوں نے انجمن کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو بھی نئی توانائی عطا کی، اردو مراٹھی اشتراک کی عصری اہمیت کو بھی انہوں نے اہمیت دی اور سب سے قابل ذکر یہ کہ انجمن کے اس سلسلہ خطبات سیرت کو انہوں نے بڑی وسعت دی جس کا آغاز ۱۹۸۰ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خطبے سے ہوا تھا، اس سلسلے کو ضیاء الحسن فاروقی، نثار احمد فاروقی، شہاب الدین دسنوی، غلام احمد برہانی کالج وغیرہ کے خطبات نے سلسلۃ زریں بنادیا، ان تقریبات میں جذب و مستی کی کیفیت، ڈاکٹر اسحاق مرحوم کی دین تھی اور یہ دولت ان کو ان کی فطرت سلیم سے حاصل ہوئی تھی، انہوں نے دین و مذہب کا ہمیشہ احترام کیا، مولانا عبدالعزیز بہاری سے تعلق اور مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری سے بیعت وارادت خود ان کی طلب صادق کی دلیل ہے۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق مخلصانہ اور والہانہ تھا، اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ انجمن کے قیام میں علامہ شبلیؒ کی ہم نوائی بدرالدین طیب جی کو حاصل تھی، علامہ شبلی بمبئی کے زمانہ قیام میں اس کے ماہانہ جلسوں میں شریک ہوتے اور تقریر بھی کرتے، انجمن اور دارالمصنفین کا یہ تعلق ہمیشہ قائم رہا، مولانا عبدالسلام ندویؒ پر جب ممبئی میں سمینار ہوا تو اس میں ڈاکٹر صاحب نے غیر معمولی دل چسپی لی، پورے سمینار میں وہ شریک رہے، المالطیفی ہال میں ان کی ہر ادا سے یہی ظاہر تھا کہ اس سمینار کی کامیابی گویا ان کی کامیابی تھی، وہ دارالمصنفین کے مسائل سے خوب واقف تھے اور مولانا ضیاء الدین مرحوم سے ان کی گفت و شنید اور خط و کتابت کا مرکزی موضوع اکثر یہی ہوتا، وہ دارالمصنفین آنے کے مشتاق تھے اور ایک بار تو جناب رضوان فاروقی کے ساتھ ان کا سفر بالکل طے تھا، ہم یہاں ان کے منتظر تھے کہ اچانک کسی وجہ سے یہ سفر فسخ ہو [illegible] سے ان کی ناسازی طبع کی خبریں ملتی تھیں، ان کے انتقال کی خبر اچانک ملی تو ان کی تصویر کے ساتھ ان کے پاکیزہ اعمال و عزائم بھی سامنے آگئے، ملت کو ایسے پاک نفس، بے غرض، باہمہ اور بے ہمہ رہنما کی کمی شدت سے محسوس ہوگی، اب ایسے صاحب جنوں کتنے ہیں جن کا ہر نقش پا جبیں رخ و گذر بن جاتا ہے۔

ع۔ص

مطبوعات جدیدہ

رمز معانی (نشور واحدی کے تنقیدی مضامین): مرتبہ: ڈاکٹر محمد ارشد خاں، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر محمد ارشد خاں اعظمی، رہبر منزل، خالص پور، اعظم گڈھ۔

نشور واحدی کی خوش گوئی اور قادر الکلامی، تعارف کی محتاج نہیں، شاعری میں اپنے مرتبہ بلند کے ساتھ ان کی نثر بھی موضوع کے لحاظ سے شائستہ اور سنجیدہ اور اسلوب میں سلیس و شستہ تھی، اس کتاب میں ان کی چند تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے جو اردو غزل، انیس و فانی، جگر، فراق اور پیام فتح پوری، ندرت کان پوری، عیش میرٹھی اور گوہر مراد آبادی کے فن اور کلام سے متعلق ہیں، فراق صاحب کی تنک مزاجی اور انا دلاغیری کا ذکر عام طور سے کیا جاتا ہے لیکن نشور صاحب نے ان کی خاکساری اور ذرہ نوازی کو ایک دلت سے تعبیر کیا ہے، میرانیس کے انفرادی رجحانات بھی اچھا مضمون ہے جس میں نشور کے انفرادی رجحانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے، ان مضامین کے علاوہ کچھ تبصرے اور خطوط بھی ہیں اور نشور کی نثر پر بعض مشاہیر کی رائیں بھی نقل کی گئی ہیں، پاکیزہ ادب کے قدردانوں کے لیے یہ مجموعہ مختصر ہونے کے باوجود بگراں قدر ہے۔

دل ناآشنا: از جناب سید شکیل دسنوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ممبئی، دہلی، علی گڑھ۔

اس خوب صورت مجموعہ اشعار کے شاعر، کا مشق سخن، طویل عرصے سے جاری ہے، گذشتہ تیس برسوں میں ان کے تین مجموعے شائع ہوئے، ان میں سے دو، زندگی اے زندگی اور تنہا تنہا کی غزلوں کا انتخاب اس دل ناآشنا کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، سخن سنجی اور سخن فہمی شاعر کو وراثت میں ملی اور سند کے لیے ان کی وطنی نسبت ہی کافی ہے، دیسنہ چھوٹا سا گاؤں سہی لیکن علم وادب کی عظیم نسبتوں نے اس کی سرزمین اور باشندوں کو ایک عالم کے لیے قابل رشک بنادیا، شکیل دسنوی کو صرف وطنی نسبت ہی حاصل نہیں، عرفان ذات و کائنات کے ساتھ اس کے اظہار کا سلیقہ بھی ودیعت ہوا ہے۔

ٹوٹا فسوں جو رنگ کے گہرے حجاب کا — زخموں سے چور چور تھا باطن گلاب کا
پل کو بحر فنا سے ابھری ہے — زندگی ایک حباب ہے یارو

سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ، پختگی نے ان کی شاعری کی داد اہل نظر سے حاصل کی، قارئین بھی اس مجموعہ کلام سے لطف اندوز ہو کر داد دینے پر مجبور ہوں گے۔

ع۔ص

سلسلہ ادب وتنقید

نمبر	کتاب	مصنف	Pages	Rs
۱	شعر العجم (اول)	علامہ شبلی نعمانی	274	85/-
۲	شعر العجم (دوم)	علامہ شبلی نعمانی	214	65/-
۳	شعر العجم (سوم)	علامہ شبلی نعمانی	192	35/-
۴	شعر العجم (چہارم)	علامہ شبلی نعمانی	230	90/-
۵	شعر العجم (پنجم)	علامہ شبلی نعمانی	206	38/-
۶	کلیات شبلی (اردو)	علامہ شبلی نعمانی	124	45/-
۷	کلیات شبلی (فارسی)	علامہ شبلی نعمانی	118	45/-
۸	موازنہ انیس ودبیر	علامہ شبلی نعمانی	312	95/-
۹	شعر الہند (اول)	مولانا عبدالسلام ندوی	496	80/-
۱۰	شعر الہند (دوم)	مولانا عبدالسلام ندوی	462	75/-
۱۱	اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندوی	410	-
۱۲	انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	224	45/-
۱۳	نقوش سلیمانی	مولانا سید سلیمان ندوی	480	75/-
۱۴	خیام	مولانا سید سلیمان ندوی	528	90/-
۱۵	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	364	115/-
۱۶	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	402	50/-
۱۷	مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	70	15/-
۱۸	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	358	70/-
۱۹	دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (اول)	خورشید احمد نعمانی	422	140/-
۲۰	دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (دوم)	خورشید احمد نعمانی	320	110/-
۲۱	مرزا مظہر جان جاناں اوران کا کلام	عبدالرزاق قریشی	236	75/-
۲۲	اردو زبان کی تمدنی اہمیت	عبدالرزاق قریشی	266	40/-
۲۳	گل رعنا	مولانا عبدالحئی حسنی	580	75/-
۲۴	صاحب المثنوی	قاضی تلمذ حسین	-	-
۲۵	اردو غزل	پروفیسر یوسف حسین خاں	762	120/-

اشتہار